مقام سنت

امام العصر محمد جعفر شاہ پھلواروی

مکتبہ امتیاز، راول پنڈی

تعداد : ۵۰۰

تاریخ اشاعت : ۲۰۰۵

قیمت : ۷۰ روپے

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

پاکستان میں اگر آپ کسی مسلمان سے پوچھیں کہ تمہارا دین کیا ہے؟ تو وہ جواب دے گا "اسلام"۔ اگر اس سے دریافت کریں کہ کیا تم چاہتے ہو کہ سارے عالم میں نہیں تو کم از کم پاکستان میں اسلام کی حکومت ہو؟ تو اس کا جواب دے گا "ضرور"۔ اب اس سے سوال کیجیے کہ "اسلام" کی حکومت سے تمہاری کیا مراد ہے تو غالباً اس کا جواب یہ ہوگا کہ اسلام کی حکومت سے مراد ہے اللہ کی حکومت یعنی اللہ کے حکم، قانون یا ہدایات کے مطابق حکومت قائم ہو۔ اب پھر اس سے پوچھیے کہ اللہ کا قانون یا حکم کیا ہے؟ کہاں ہے؟ تو آج کل بالعموم اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ جو کچھ "کتاب وسنت" میں ہے۔ کتاب سے کیا مراد ہے؟ اس کا جواب ہر کلمہ گو کے پاس ایک ہی ہے یعنی کتاب اللہ یا قرآن کریم۔ یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر ساری امت محمدیہ کا اتفاق ہے اور کسی فرد مسلم کو اس کی تردید کی جرأت نہیں...... لیکن "سنت" کیا چیز ہے؟ اس بارے میں ہر گروہ اور ہر فرقہ ایک الگ تصور رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سنت رسولؐ ہر ایک کی نظر میں جداگانہ مفہوم رکھتی ہے۔ سنت کا تعلق اس ذخیرہ روایات سے ہے جو کتب احادیث میں پھیلا ہوا ہے۔ یہاں آ کر ہر فرقہ

دوسرے سے الگ ہو جاتا ہے اور اس علیحدگی کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک کے پاس اپنا الگ الگ ذخیرہ موجود ہے، جس کی بنیاد پر اس نے اپنا ایک جداگانہ مسلک اختیار کر لیا ہے۔ اس میں باہم مشترک چیزیں بھی ہیں اور متخالف بھی۔ [1]

ظاہر ہے کہ اگر حکومت پاکستان بڑی احتیاط سے بھی کوئی اسلامی قانون مرتب کرا کے

---

[1] اس کی مثال میں یہ دلچسپ روایت پیش کی جا سکتی ہے جو طبرانی نے اپنی ''اوسط'' میں عبدالوارث کی زبانی یوں لکھی ہے:

''میں مکے گیا تو وہاں ابوحنیفہ، ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ تینوں اتفاق سے موجود تھے۔ میں نے ابوحنیفہ سے دریافت کیا کہ آپ اس بیع کے متعلق کیا فرماتے ہیں جس میں کوئی شرط بھی رکھ دی گئی ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ایسی بیع بھی ناجائز ہے اور وہ شرط بھی۔ پھر میں نے یہی مسئلہ ابن ابی لیلیٰ سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ بیع تو درست ہے لیکن شرط غلط ہے۔ پھر ابن شبرمہ سے یہی سوال کیا تو انہوں نے بتایا کہ یہ بیع اور شرط دونوں ہی درست ہیں۔ میں نے کہا سبحان اللہ! عراق کے ان تینوں فقہا میں یہ اختلاف؟ پھر میں نے ابوحنیفہ کے پاس جا کر ان تینوں مختلف جوابات کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ دونوں (ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ) نے کیا جواب دیا۔ مجھ سے عمرو بن شعیب نے، ان سے ان کے والد نے اور ان سے ان کے دادا نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ حضورؐ نے بیع و شرط سے منع فرمایا ہے۔ لہٰذا بیع اور شرط دونوں باطل ہیں۔ پھر میں نے ابن ابی لیلیٰ کے پاس آ کر اس کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا میری سمجھ میں ان دونوں (ابوحنیفہ اور ابن شبرمہ) کے جواب نہیں آ سکے۔ مجھ سے تو ہشام بن عروہ نے، ان سے ان کے والد نے اور ان سے حضرت عائشہؓ نے بیان کیا کہ حضورؐ نے مجھے حکم دیا کہ بریرہؓ کو خرید لو، پھر اسے آزاد کر دو۔ لہٰذا بیع درست اور شرط غلط ہے۔ پھر میں نے ابن شبرمہ کے پاس جا کر صورت حال بیان کی تو انہوں نے فرمایا کہ میں ان دونوں (ابوحنیفہ اور ابن لیلیٰ) کے جواب نہیں سمجھ سکتا۔ مجھ سے تو مسعر بن کدام نے، ان سے محارب بن دثار نے، اور ان سے جابر نے بیان کیا ہے کہ میں نے حضورؐ سے ایک اونٹنی کا معاملہ کیا اور مدینے تک لا دینے کی شرط بھی رکھی۔ لہٰذا بیع اور شرط دونوں ہی جائز ہیں۔''

نافذ کرے تو ہر قدم پر متخالف چیزوں میں سے ایک کو ترک کرنا پڑے گا۔ دونوں کا ایک ساتھ نفاذ نہیں ہوسکتا اور جب ایک مسلک کے کسی جزیئے کو ترک کیا جائے گا تو جو فرقہ اسے جان سے زیادہ عزیز سمجھ کر سینے سے لگائے ہوئے ہے ناراض ہوگا اور یہی طعنہ دے گا کہ یہ اسلام کا نفاذ نہیں بلکہ ایک فرقے کے مسلک کا نفاذ ہے، اس لیے ضروری ہے کہ سنت کا مفہوم اور مقام متعین ہو۔

ہم نے سنت کے لیے ''مفہوم'' اور ''مقام'' دونوں چیزوں کا ذکر کیا ہے تو ان دونوں کا تعلق کتب احادیث سے ہے جن کے متعلق قدرۃً یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ:

۱۔ سنت سے فی الواقع کیا مراد ہے؟ سنت روایات و احادیث ہیں یا کوئی اور چیز ہے؟

۲۔ اگر روایات و احادیث سنت ہیں تو وہ سب کی سب واجب الاتباع ہیں یا بعض۔

۳۔ جتنا حصہ واجب الاتباع ہے وہ قرآن کی طرح ابدی اور ناقابل تغیر ہے یا اس میں حسب ضرورت تغیر و تبدل ہوسکتا ہے۔

یہاں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ عبدالوارث نے صرف ایک مسئلے کا اور ایک ہی جگہ کے اور صرف تین فقہا سے جواب دریافت کیا تھا۔ اگر وہ دوسرے فقہا سے اور پھر دوسرے شہروں میں دوسرے مسائل بھی دریافت کرتے تو ایک ہی سوال کے بہت سے جواب کا ملنا بعید نہ تھا۔ بہرکیف ایک استفتیٰ کے جواب میں مختلف فقہا کے بہت سے جواب کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن جو چیز الجھن پیدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں تینوں فقہا اپنے جواب کی بنیاد تین حدیثوں پر رکھتے ہیں اور تینوں حدیثیں باہم متصادم ہیں۔ ایسے مواقع پر یہ دشواری پیدا ہوگی کہ کسی ایک کو قبول کرنے کے بعد بقیہ دو کو ترک کرنے کا اعتراض پیدا ہوگا۔

یہ اوراس طرح کے دوسرے سوالات ہیں جن کے جواب میں اس وقت دو گروہ الگ الگ نظریات رکھتے ہیں۔ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ احادیث بھی قرآن ہی کی طرح من وعن واجب التسلیم ہیں کیونکہ دونوں وحی ہیں۔فرق صرف جلی وخفی یا متلو وغیر متلو کا ہے۔اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

الف۔ قرآن پاک میں ہر جگہ اطاعت خداوندی کے ساتھ اطاعت رسول کا حکم دیا گیا ہے۔اطاعت الٰہی تو اطاعت قرآن ہوئی۔رہی اطاعت رسول تو وہ بجز احادیث کی اطاعت کے اور کیا ہو سکتا ہے؟

ب۔ حضور نے فرمایا ہے کہ ''اوتیت مثلہ معہ'' ہمیں قرآن ہی جیسی قرآن کے ساتھ ایک اور چیز بھی دی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ احادیث کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔لہٰذا جس طرح قرآن کی اطاعت ضروری ہے اسی طرح احادیث کی اطاعت بھی فرض ہے۔

ج۔ قرآن مجمل ہے یعنی بہت سے احکام قرآن پاک میں تفصیل سے نہیں بیان کیے گئے ہیں۔ان کی تفصیل حضورؐ نے فرمائی ہے۔اگر ہم ان تفاصیل کو چھوڑ دیں تو قرآن حکیم پر عمل ہی نہیں ہو سکتا اور اگر خود اس کی تفصیل کریں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم رسولؐ کی تفصیلات پر اپنی تفصیلات کو ترجیح دیتے ہیں اور یہ صریحاً اطاعت رسولؐ سے گریز اور مفر ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ دین فقط قرآن ہے جسے کسی تفصیل کی ضرورت نہیں۔رہی حدیث تو یہ اس دین کے اطلاق (application) کی تاریخ ہے۔نہ وحی ہے نہ مثل القرآن مع القرآن۔اس لیے وہ ایسی مضبوط بنیاد نہیں جو وحی قرآنی کی طرح بنیاد دین بنے اور ناقابل تغیر ہو۔بنیاد دین کسی یقینی چیز کو ہونا چاہیے اور حدیثیں چونکہ ظنی ہیں، لہٰذا دین جیسی یقینی چیز کی بنیاد نہیں بن سکتیں۔اس کے دلائل یہ ہیں کہ:

الف۔ اگر قرآن کی طرح حدیث بھی بنیاد دین ہوتی تو قرآن ہی کی طرح اسے بھی محفوظ شکل میں امت کو دے دیا جاتا۔

ب۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ لاتکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی شیئا فلیمحہ (قرآن کے سوا میری اور کوئی چیز نہ لکھو اگر کسی نے کچھ لکھا ہو تو وہ مٹا دے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث مثل القرآن مع القرآن نہیں ورنہ حضورؐ کتابت حدیث سے نہ روکتے بلکہ اس کا حکم دیتے۔

ج۔ قرآن خود اپنے آپ کو تبیانا لکل شیٔ (۸۹:۱۶) اور تفصیل کل شی (۱۲:۱۱۱) کہتا ہے، لہٰذا اسے مجمل مان کر اس کی تفصیلات کو احادیث میں تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

ہم نے دونوں گروہوں کی فقط موٹی موٹی اور بنیادی دلیلیں لکھی ہیں جو تفصیلات کا گویا مغز ہیں۔ اگر آپ دونوں کے دلائل کو دیکھیں تو دونوں ہی وزن دار معلوم ہوں گی۔ اب ہمیں بڑی سنجیدگی سے دونوں مسلکوں کا جائزہ فکری و علمی طریق پر لینا چاہیے۔ اس بحث کا تجزیہ کرنے کے لیے اگر ہم تین باتوں کی تحقیق کر لیں تو بہت سی گتھیاں سلجھ جانے کی توقع ہے۔ وہ تینوں باتیں یہ ہیں:

اولاً یہ کہ آیا وحی صرف ایک یعنی جلی یا متلو یا ملفوظ۔ دوسرے لفظوں میں قرآن ہے یا اس کے علاوہ اور بھی کوئی قسم ہے، جسے غیر متلو یا خفی یا غیر ملفوظ کہتے ہیں۔

ثانیاً یہ کہ اگر واقعی قرآن کے علاوہ بھی کسی اور وحی کا وجود ہے جو پیغمبر پر آتی تھی تو ہمیں اس کا کس حد تک پابند کیا گیا ہے اور دونوں وحیوں میں بہ لحاظ اتباع کے کیا فرق ہے؟

ثالثاً یہ کہ سنت کے اتباع سے کس چیز کا اتباع مراد ہے۔

اگر ان تین باتوں پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو باہمی تباعد کی خلیج اگر بالکل ختم نہ ہو تو تنگ تر ہو سکتی ہے۔ ہم سب سے پہلے لفظ وحی پر بحث کریں گے۔

پہلا باب

اول: وحی کے لغوی معنی

دوم: وحی کے اطلاقات قرآن پاک میں

سوم: وحی سے تعلق رکھنے والی اصطلاحیں

چہارم: وحی کی متفق علیہ اور مختلف فیہ قسم (خفی وجلی)

بحث اول

وحی کے لغوی معنی

مفردات میں راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

اصل الوحی الاشارة السریعة ولتضمن السرعة قیل امر وحی وذلك یکون بالکلام علی سبیل الرمز والتعریض وقد یکون بصوت مجرد عن الترکیب و باشارة ببعض الجوارح وبالکتابة۔

وحی کے اصلی معنی ہیں وہ اشارہ جو نہایت تیزی وسرعت کے ساتھ ہو۔ اسی سرعت کی وجہ سے کہتے ہیں امر وحی۔ یعنی جلد سے جلد ظاہر ہونے والی بات، اور یہ کبھی تو گفتگو میں ہوتی ہے، کبھی اشاروں کنایوں میں یا محض آواز ہوتی ہے جو حروف والفاظ کی ترکیب وربط سے خالی ہوتی ہے اور کبھی بذریعۂ تحریر۔

گویا جو بات جلد سے جلد ادا کی جائے خواہ وہ لفظی اشاروں میں ہو یا آواز محض ہو، چشم وابرو اور ہاتھ پاؤں کا اشارہ ہو یا حروف ونقوش کی شکل میں ہو سب کی سب لغۃً وحی میں داخل ہیں اور ہر ایک کی معنوی روح "اشارۂ سریعہ" ہے۔

ان اقسام کو آیات قرآنیہ پر چسپاں کرنے سے پہلے اپنی محسوسات کی دنیا میں چند مثالوں سے سمجھ لینا بہت مفید ہوگا۔

مجرد آواز

اس کی کئی شکلیں ہوتی ہیں لیکن کسی میں بھی نہ لفظ ہوتے ہیں نہ الفاظ کا مجموعہ یعنی جملہ، بلکہ حروف بھی نہیں ہوتے۔ بس ایک آواز ہوتی ہے اور وہ کسی خاص مفہوم کی حامل ہوتی ہے۔ مثلاً:

سائرن بجا اور اسی وقت پوری سرعت کے ساتھ مفہوم سمجھ لیا گیا کہ: ''دشمن کے طیارے حملے کے لیے آرہے ہیں۔ اپنی اپنی حفاظت کا سامان کرلو۔ زمین دوز قلعوں میں چھپ جاؤ یا جہاں کہیں کھڑے ہو وہیں لیٹ جاؤ۔''

ل کا بھونپو یا ملٹری کا بگل بجا اور مفہوم ذہن میں آگیا کہ: ''اتنے بج چکے ہیں تیار ہو کر گھروں سے چل پڑو اور اپنی اپنی ڈیوٹی پر پہنچ کر کام شروع کردو۔''

دروازے پر دستک یا کھٹ کھٹ کی آواز آئی اور سمجھنے والے نے سمجھ لیا کہ: فلاں شخص آگیا جو دروازہ کھولنے کا مطالبہ کر رہا ہے۔

یہ سب اصوات محضہ اور مجرد آوازیں ہیں جن میں حروف، الفاظ اور ان کی صرفی ونحوی ترکیبیں نہیں ہوتیں مگر منٹوں میں ادا ہونے والے الفاظ اور جملوں کو یہ آوازیں ایک سیکنڈ میں ادا کر دیتی ہیں اشارۂ سریعہ کی یہ بھی ایک قسم ہے۔

اعضا وجوارح

یہ کام کبھی انگلیوں اور ہاتھوں سے بھی لیا جاتا ہے۔ کسی چوراہے پر پولیس مین کو دیکھئے وہ کس طرح ٹریفک کو ہاتھوں، انگلیوں اور آنکھوں کے اشارے سے ادھر سے ادھر گزارتا

ہے۔اس کی ایک ایک حرکت اور اشارہ ایک بڑے جملے کا قائم مقام ہوتا ہے اور روزمرہ ہم آپ بھی اپنی گردن، آنکھ، ہاتھ، انگلی وغیرہ کو حرکت دے کر اپنا ایک لمبا مفہوم ایک سیکنڈ میں ادا کر لیتے ہیں۔عقد انامل اور بعض فوجی اشاروں کو بھی اسی میں داخل سمجھنا چاہیے۔

کتابت

یہی مقصد عموماً کتابی شکل میں پورا ہوتا ہے۔قرآن پاک کے رموز اوقاف اور دیگر (punctuation) اور سب سے زیادہ شارٹ ہینڈ اس کی واضح مثال ہے۔

مختصر اور اصطلاحی الفاظ

یہی کام بہت ہی مختصر لفظ سے لیا جاتا ہے۔مثلاً چند آدمی طے کر لیں کہ جب کہا جائے ''پھول'' تو سمجھ لینا کہ فلاں بات کہی جا رہی ہے۔اس سے زیادہ واضح شکل وہ اصطلاحی الفاظ ہیں جن کے صحیح مفہوم کو ادا کرنے کے لیے کافی وقت صرف ہوتا ہے، لیکن اس ایک لفظ میں پورے مفہوم کو ادا کر دیا جاتا ہے۔ اس کی مثال میں پی ٹی کے تمام کاشنز (cautions) کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً پریڈ کرانے والا کہتا ہے کہ اٹینشن (attention)، یہ لفظ ایک ہے لیکن اس کا مفہوم بہت لمبا ہے۔یعنی اس طرح کھڑے ہو جاؤ کہ قد سیدھا ہو، گردن راست ہو، نگاہ سامنے ساٹھ فیٹ پر ہو، بدن میں کہیں جنبش نہ ہو، دونوں ہاتھ نیچے تنے اور بدن سے ملے ہوں، ساری انگلیاں متصل ہوں اور مفصل دوم سے مڑی ہوں، انگوٹھے سیدھے اور انگشت شہادت سے پیوست ہوں، ایڑیاں باہم ملی ہوں اور قد پینتالیس ڈگری کا زاویہ بنا رہے ہوں وغیرہ وغیرہ۔اتنی لمبی کارروائی کے لیے صرف ایک لفظ ہے ''اٹینشن'' اور سننے والے کے ذہن میں ایک ثانیہ گزرنے سے پہلے یہ تمام مفہوم دفعتہً آ جاتا ہے اور دوسرا ثانیہ گزرنے سے پہلے وہ اس پر عمل کر چکتا ہے۔ یہ بھی اشارہ

سریعہ ہی کی ایک شکل ہے۔

جھنڈی اور روشنی

یہی کام بعض اوقات جھنڈیوں اور مختلف رنگ کی روشنیوں سے بھی لیا جاتا ہے۔ ملٹری میں جب دل چاہے اس کا مشاہدہ فرمالیجیے۔ امام راغب اصفہانی کے زمانے میں اگر اس کا رواج ہوتا تو جہاں اشارۂ سریعہ کی چار قسمیں گنائی ہیں وہاں اس پانچویں قسم کو بھی ان میں داخل کر لیتے اور اس کے علاوہ آئندہ دور میں معلوم نہیں کیا کیا شکلیں مزید ایجاد ہوتی رہیں گی۔

اہل لغت کی کچھ اور تصریحات

دوسرے عربی لغات میں، لفظ وحی کے اور معانی بھی لکھے ہیں جن میں بہت سے معانی خود اصفہانی کی مندرجہ بالا تصریحات میں بھی آگئے ہیں۔ مثلاً اقرب الموارد میں ہے:

وحی الیہ : اشار (اشارہ کیا)

وحی و اوحی الکتاب، کتب (لکھا)

وحی الیہ الکلام۔ کلمہ خفیا (آہستہ بولا)

وحی الرجل۔ اسرع (تیزی اختیار کی)

وحی الذبیحۃ۔ ذبحھا ذبحا رخیاً (سرعت کے ساتھ ذبح کر ڈالا)

وحی اللہ فی قلبہ۔ الھمہ، (الہام کیا)

وحی الیہ۔ ارسل الیہ رسولا (پیغمبر بھیجا)

ان مذکورہ معانی کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کے لفظ میں سرعت اشارہ کا مفہوم مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی مختلف شکلیں ہیں۔ کتابت، خفا، آواز، عضوی حرکات وغیرہ...... خفا کا مفہوم غالباً اس لیے پیدا ہوا کہ اشارے عموماً مشیر اور مشار الیہ کے درمیان سمجھی ہوئی بات ہوتے ہیں اور دوسرے سے مخفی رہتے ہیں۔

بحث دوم

وحی کے اطلاقات قرآن میں

اب قرآن پاک کو دیکھیے تو اس میں اس لفظ (وحی) کی نسبت اللہ کی طرف ہے اور غیر اللہ کی طرف بھی۔ پہلے ان مقامات کو دیکھیے جہاں فعل وحی کی نسبت فاعلی غیر اللہ کی طرف ہے ان میں یہ تین ہیں:

۱۔ پیغمبر۔ مثلاً:

فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ أَن سَبِّحُوا بُكْرَةً وَعَشِيًّا (۱۱:۱۹)

(یعنی اشارے سے کہا) کہ صبح و شام اللہ کی تسبیح بیان کرتے رہو۔

۲۔ فرشتے۔ مثلاً:

......أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ (۵۱:۴۲)

یعنی (کلام الٰہی کی تیسری صورت یہ ہے کہ) اللہ کوئی فرشتہ بھیجتا ہے اور وہ فرشتہ حکم الٰہی وحی کرتا ہے۔ (یعنی پیغام دیتا ہے)

۳۔ انسی اور جنی شیاطین۔ مثلاً:

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ

إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوراً (١١٢:٦)

اور یوں ہی ہم نے ہر نبی کے لیے انسی اور جنی شیطانوں کو دشمن بنا رکھا ہے جو فریب دینے کی غرض سے ایک دوسرے کی طرف چکنی چپڑی باتوں کی وحی کرتے ہیں (یعنی رموز اور اشاروں میں یہ باتیں کرتے ہیں)

اب ان مقامات کو دیکھیے جہاں اللہ تعالیٰ نے فعل وحی کی نسبت خاص اپنی طرف فرمائی ہے۔ ان میں ہر جگہ موحی الیہ (یعنی جس کی طرف وحی کی گئی ہو) کی رعایت سے وحی کے معانی اور مفہوم الگ الگ نوعیتوں کے حامل ہیں۔ دیکھیے یہ لفظ اللہ تعالیٰ کس کس کے لیے استعمال فرماتا ہے:

۱۔ زمین کے لیے۔ مثلاً:

بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَى لَهَا (٩٩:٥)

زمین اپنی خبریں بتائے گی اس لیے کہ اس کے لیے اللہ وحی فرمائے گا۔

۲۔ آسمان کے لیے مثلاً:

وَأَوْحَى فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا (١٢:٤١)

ہر آسمان میں اللہ تعالیٰ نے اپنا حکم وحی فرمایا۔

۳۔ مگس شہد کے لیے۔ مثلاً:

وَأَوْحَى رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ (٦٨:١٦)

اللہ نے مگس شہد کی طرف وحی فرمائی کہ......اس طرح شہد کا چھتا تیار کر)

۴۔ فرشتوں کے لیے۔ مثلاً:

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَآئِكَةِ ......(١٢:٨)

جب اللہ تعالیٰ فرشتوں کی طرف وحی فرما رہا تھا کہ......اہل ایمان کو ثابت قدم رکھو۔

۵۔ مسیح کے حواریوں کے لیے۔ مثلاً:

وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ ......(۵:۱۱۱)

جبکہ میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ...... مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ۔

۶۔ حضرت یوکبد (والدۂ موسیٰ) کے لیے۔ مثلاً:

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ ......(۲۸:۷)

اور ہم نے والدہ موسیٰ (یوکبد) کی طرف وحی کی کہ...... اس بچے کو سمندر میں ڈال دو۔

۷۔ یوسف کے لیے قبل از نبوت۔ مثلاً:

وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُم ......(۱۲:۱۵)

اور ہم نے یوسفؑ کی طرف وحی کی کہ...... تم اپنے بھائیوں کو یہ بات بتا کے رہو گے۔

۸۔ انبیاو مرسلین کے لیے جس سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ وحی خداوندی کن کن چیزوں کی طرف ہوتی ہے؟ کیا یہ تمام وحیاں ایک ہی نوعیت کی ہیں؟ اور کیا وہ تمام چیزیں جن کی طرف وحی ہوتی ہے، یا ہوئی، انبیا کی صف میں داخل ہیں؟ یقیناً نہیں۔ ان میں فرق ہے۔ مقصد میں بھی اور نوعیت میں بھی۔ مختصراً ہر ایک کو ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ زمین یا آسمان کے لیے وحی کرنے کا مطلب ہے تسخیر یعنی تکوینی طور پر پابند حکم کر دینا جس میں آسمان و زمین کے ارادہ یا شعور کو کوئی دخل نہیں۔

۲۔ مگس شہد کی طرف وحی کرنے سے غرض ہے، قانون فطرت میں جکڑ دینا جس میں اس کی حرکت ارادی کو بھی دخل ہے۔

۳۔ فرشتوں کی طرف وحی کرنے کے معنی ہیں ان کو حکم دینا جسے وہ ٹالنے کی قدرت یا صلاحیت نہیں رکھتے۔

۴۔ حواریوں کی طرف وحی کرنے سے مقصد ہے ان کے دلوں میں ایک بات (جذبہ قبول) ڈال دینا جس میں ان کے ارادے واختیار کو بھی دخل ہے۔

۵۔ یوکبد کی طرف وحی کرنے کا مفہوم ہے ایک خطرناک اقدام کے لیے حوصلہ افزائی اور خوشگوار نتیجے کا یقین پیدا کر دینا۔

۶۔ یوسفؑ کی طرف وحی کرنے سے مراد ہے ایک پرخطر اور تاریک فضا میں روشن مستقبل کی پر یقین جھلک دکھا دینا۔

۷۔ اور پیغمبروں کی طرف وحی کرنے کا مطلب ان سب کے سوا ہے، جس کا ذکر آگے آئے گا۔

ان کے علاوہ جن آیات میں وحی کی نسبت فاعلی غیر اللہ کی طرف کی گئی ہے وہاں بھی معانی الگ الگ ہیں، حضرت زکریا کے وحی کرنے کا مطلب لوگوں کو اشارے سے بتانا ہے۔ فرشتوں کے وحی کرنے کا مقصد پیغام الٰہی کو ٹھیک ٹھیک حکم خداوندی کے مطابق پہنچانا ہے اور شیطانوں کے وحی کرنے سے مراد اشاروں یا رموز میں بات کرنا ہے یا دل میں وسوسہ ڈالنا۔

قدر مشترک

ان تمام معانی کو دیکھ جائیے تو ایک چیز سب میں قدر مشترک کے طور پر نظر آئے گی اور وہ ہے اشارہ اور وہ بھی اشارۂ سریعہ، جس میں تیز رفتاری ہو، دیر اور سستی نہ ہو۔

ایک لفظ کے مختلف مفہوم کی مثال

گویا ''وحی'' ایک ایسا لفظ ہے جو بہت سے مواقع پر استعمال ہوتا ہے لیکن ہر جگہ مفہوم کی نوعیت جداگانہ ہوتی ہے۔ اس کی مثال کے لیے ہم اپنی زبان میں لفظ ''اڑنا'' کو پیش کر سکتے ہیں۔ طوطا اڑا، شہر اڑ گیا، دماغ اڑا جاتا ہے، پتنگ اڑ رہی ہے، پوسٹ اڑ گئی، افسر اڑ

گیا، دلیل اڑ گئی، ہاتھوں سے طوطے اڑ گئے۔ ہر مثال میں ''اڑنے'' کا لفظ استعمال ہو رہا ہے، لیکن ہر ایک کا مفہوم جداگانہ ہے لیکن دور ہونے اور غائب ہونے کا مفہوم سب میں قدر مشترک کی طرح موجود ہے۔ ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جن جن چیزوں پر وحی کی جاتی ہے ان سب پر اگرچہ وحی کا اطلاق تو ہوتا ہے لیکن سب کی حیثیتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ زیادہ وضاحت کے لیے دیکھئے ''جسم'' کا اطلاق پتھر پر بھی ہوتا ہے اور درخت پر بھی، چوپائے پر بھی اور انسان پر بھی۔ ہر ایک پر جسم کا اطلاق درست ہے کیونکہ منطقی اصطلاح میں جسم ہر وہ شے ہے جس میں ابعاد ثلاثہ......طول، عرض، حجم......موجود ہو۔ لیکن سب کی جسمیت میں فرق ہے، اس طور پر کہ پتھر بھی جسم ہے اور درخت بھی لیکن درخت میں ایک صفت ''نمو'' زائد ہے اور چوپائے میں درخت سے بھی ایک وصف زیادہ ہے یعنی ''حرکت بالارادہ'' اور انسان میں ایک اور مزید وصف بھی ہے یعنی ''نطق'' گویا پتھر فقط جسم ہے، درخت جسم نامی ہے، چوپایہ جسم نامی متحرک بالارادہ ہے اور انسان جسم نامی، متحرک بالارادہ اور ناطق ہے جسے مختصر لفظوں میں ''حیوان ناطق'' کہتے ہیں۔ انسان کو تمام دوسری مخلوقات سے ممتاز کرنے والی شے صرف نطق ہے۔ لیکن نطق ہونے کے یہ معنی نہیں کہ انسان ناطق محض ہے اور کچھ بھی نہیں، بلکہ اس کے ناطق ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ جوہر بھی ہے جسم نامی بھی ہے، متحرک بالارادہ بھی ہے اور نچلے درجے کی مخلوقات کی یہ تمام صفات رکھتے ہوئے ناطق بھی ہے۔

مماثلت

بالکل اسی طرح کہ ''صاحب رق'' زمین، آسمان، مگس شہد، فرشتے، اولیا اللہ......حواری، یوکبد اور یوسف (قبل از نبوت)......وغیرہ سب ہیں اور پیغمبر بھی صاحب وحی

ہے۔لیکن پیغمبر نچلے درجے کے تمام ''صاحبان وحی'' کی وحیوں کا بھی حامل ہوتا ہے جو اسے ہر غیر پیغمبر شے سے ممتاز کر دیتی ہے۔

موضوع بحث

ہم اس وقت زمین و آسمان، مگس اور فرشتے کی وحی سے بحث نہیں کریں گے۔ ہمارا موضوع صرف وہ وحی ہے جو انسانوں پر آتی ہے۔گزشتہ آیات میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ دو طرح کے انسان ہیں جن پر وحی آتی ہے۔ایک نبی پر اور دوسرے غیر نبی پر...... ہم دونوں کے فرق کے لیے انبیا اور اولیا کے لفظ استعمال کریں گے۔...... انبیا کی وحی سے تو سارا قرآن بھرا پڑا ہے، اس کے دلائل دینے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اولیا کی وحی ذرا غور طلب ہے۔

اولیائی وحی

آپ نے اوپر کی آیات میں دیکھا کہ اللہ تعالی نے حواریوں پر وحی کی اور اس وحی کے مطابق وہ تمام خطرات سے بے پروا ہو کر ایمان لے آئے...... جناب یوکبد علیہا السلام پر بھی وحی ہوئی اور اس جنس ضعیف نے فطرت مادری کے قطعاً خلاف ایک ایسا اقدام کر لیا، جو وحی کے سہارے کے بغیر ناممکن تھا۔کون ماں ہے جو اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنے ہاتھوں سے صندوق میں رکھ کر سمندروں کی کوہ پیما موجوں کے حوالے کر کے خاموش رہے اور اطمینان قلب میں ذرا فرق نہ آئے؟

إِن كَادَتْ لَتُبْدِىْ بِهٖ لَوْلَآ أَن رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا (۲۸:۱۰)

اگر ہم نے اس کے دل کو سہارا نہ دیا ہوتا تو اس نے یہ راز فاش ہی کر دیا ہوتا۔ [1]

ایسی ہی وحی قبل از نبوت جناب یوسف صدیق پر آئی۔ ادھر جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور ادھر وحی نے صبر و یقین کے نور سے قلب کو بھر دیا۔ اس پیکر جمال کا صبر و یقین ملاحظہ فرمایئے اہل قافلہ اسے نکالتے ہیں، بھائی ان کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں، قافلہ اسے مصر لے جا کر فروخت کرتا ہے۔ عزیز مصر کے گھر کا مالک و مختار بنتا ہے، پھر وہ قید خانے کی مصیبتیں جھیلتا ہے، پھر شاہ مصر اپنے سارے اختیارات سونپتا ہے، ظالم بھائیوں سے دو بار ملاقات ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے مگر کسی موقعے پر وہ اپنا تعارف بھی نہیں کراتا،

---

[1] بعض اوقات یوں ہی انسان کے دل میں کوئی بات سوجھ جاتی ہے لیکن جناب یوکبد کے ساتھ یہ معاملہ نہ تھا۔ یوں ہی بیٹھے بیٹھے کس ماں کے دل میں یہ خیال آ سکتا ہے کہ چلو اپنے بچے کو ذرا سمندر میں ڈال کر دیکھیں شاید اسی طرح اس کی حفاظت کی کوئی شکل نکل آئے؟ اور فرض کیجیے اگر ایسا خیال آ بھی جائے کہ اس کی واپسی کا کوئی انتظام خود بخود ہو جائے گا تو کیا یہ بھی خود بخود سوجھ سکتا ہے کہ یہ بچہ تو پیغمبر بھی بننے والا ہے؟ قرآن کے ان الفاظ پر غور کیجیے:

إِنَّا رَادُّوهُ إِلَيْكِ وَجَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ (۲۸:۷)

ہم اسے تیرے پاس لوٹا کر رہیں گے اور اسے تو ہم پیغمبر بھی بنانے والے ہیں۔

یہ خیال جو حضرت یوکبد کے دل میں آیا اس کی حقیقت کیا تھی اس سے اگلی آیت میں یوں بتایا گیا ہے:

فَرَدَدْنَاهُ إِلَىٰ أُمِّهِ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ (۲۸:۱۳)

ہم نے موسیٰؑ کو ان کی ماں کے پاس پہنچا دیا تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور اس کا حزن دور ہو جائے اور اسے معلوم ہو جائے کہ خدا کا وعدہ سچا ہے۔

پس یہ خیال یوں ہی دل میں نہیں آ گیا تھا بلکہ یہ خدائی وعدہ تھا جو مادر موسیٰؑ سے کیا گیا تھا۔ اس وحی کی کیا نوعیت تھی؟ اس کی تشریح آگے آئے گی، جہاں انبیا و اولیا کی وحیوں کا فرق بتایا گیا ہے۔

کوئی فریاد نہیں کرتا، کسی کو نہیں بتاتا کہ میں کون ہوں، کیا ہوں، کہاں سے آیا، کس طرح لایا گیا، کیا کیا ظلم سہے؟ کبھی کوئی حرف شکایت زبان پر نہ لایا، کبھی کسی سے التجا نہ کی کہ مجھے گھر پہنچوادو، ماں باپ کو دیکھ لوں۔ مصر کا مختار کل ہونے کے بعد بھی ایسی کوشش نہیں کرتا۔ یہ پیکر صبر و رضا خاموش رہا، ہمیشہ خاموش رہا اور اس وقت تک خاموش رہا جب تک اس کے اظہار کا ٹھیک وقت نہ آ گیا۔ ادھر پدر بزرگوار نے

فَتَحَسَّسُواْ مِن يُوسُفَ وَأَخِيهِ (۱۲:۸۷)

فرمایا اور ادھر اس مجسمہ صبر و یقین نے

لتنبئنهم بامرهم هذا

کا ٹھیک وقت معلوم کر لیا۔ یہ صبر آزما یقین یوسف صدیقؑ کو اسی وقت پیدا ہو چکا تھا، جب قبل از نبوت اندھے کنوئیں میں گرائے جاتے وقت لتنبئنهم کا ''غیر پیمبرانہ'' مژدہ وحی آیا تھا۔

مسئلے کی نزاکت

آپ نے دیکھا؟ غیر پیغمبر...... اولیا اللہ...... پر بھی وحی آتی ہے۔ نہ حواری نبی تھے نہ یوکبد رسول تھیں اور نہ یوسف ابھی پیغمبر ہوئے تھے لیکن وحی ربانی سے سب نوازے جاتے ہیں اور ان سب کو اپنی اپنی وحی پر تقریباً اتنا ہی یقین ہوتا ہے جتنا پیغمبر کو اپنی وحی پر ہوتا ہے۔ مسئلہ بہت نازک ہے اور ذرا سی لغزش بڑی سے بڑی گمراہی کا سبب بن سکتی ہے۔ کہنا یہ ہے کہ انسانوں میں انبیا اور اولیا دونوں پر وحی آتی ہے۔ دونوں پر خدا کی طرف سے ہوتی ہے اور دونوں کو اپنی اپنی وحی پر قریباً یکساں یقین ہوتا ہے۔ اس کے باوجود نبی نبی ہے اور ولی ولی...... ایسا کیوں ہے؟ دونوں کی وحی میں کیا فرق ہے؟ یہ ایک سوال ہے...... اہم سوال......

جس کا ہمیں جواب تلاش کرنا ہے۔ ایسا جواب جو دونوں کے فرق کو بالکل واضح کر دے۔

کچھ ضروری باتیں

لیکن اس کو پوری طرح سمجھنے کے لیے چند ضروری باتیں جاننا ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ انسان جب بھی کچھ بولنا چاہے تو اسے پہلے کچھ سوچنا پڑتا ہے۔ یعنی پہلے خیال...... مجرد خیال...... آتا ہے، اور اس کے بعد ہی زود یا بادیر وہ خیال الفاظ کا جامہ پہنتا ہے۔ کوئی خیال خود بخود بھی ذہن میں آتا ہے اور شیطان بھی ڈالتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی القا فرماتا ہے۔ ہمیں یہاں صرف ان ہی خیالات سے بحث مقصود ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کے دل میں ڈالے جاتے ہیں۔ اس سے تو انکار نہیں ہوسکتا کہ عموماً جب کوئی خیال ہمارے دماغوں میں آتا ہے تو وہ الفاظ کے ساتھ آتا ہے لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ خیالات جب بھی آتے ہیں تو الفاظ کے ساتھ ہی آتے ہیں بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم دماغ میں کوئی خیال آتے ہی اسے الفاظ میں ادا کرنے کے مشاق ہو چکے ہیں اور یہ مشق اتنی زیادہ ہو چکی ہے کہ خیال اور لفظ کے درمیانی وقفے کو محسوس کرنا خود ہمارے اپنے لیے بھی دشوار ہے اور اس کی مثال ایسی ہوگئی ہے جیسے برقی قمقمے کی روشنی، کہ ایجابی و سلبی تار کے ملتے ہی ایک سیکنڈ کے لاکھویں حصے میں قمقمہ روشن ہو جاتا ہے، یہ محسوس کرنا ناممکن ہوتا ہے کہ پہلے دونوں تار ملے یا پہلے قمقمہ روشن ہوا۔ اگر تاروں اور قمقموں کے درمیان کروڑوں میل کا فاصلہ ہو تو یہ فرق محسوس ہوسکتا ہے۔ لیکن فاصلے کی کمی اور برق کی برق رفتاری کی وجہ سے تقدیم و تاخیر کا فرق محسوس نہیں کیا جاسکتا۔ بالکل یہی شکل خیال اور الفاظ کی ہے کہ خیال آتے ہی فوراً الفاظ بھی ہمارے ذہن میں آجاتے ہیں اور اب ہمارے لیے یہ محسوس کرنا تقریباً محال ہو گیا ہے کہ پہلے خیال آتا ہے یا پہلے لفظ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خیال ہمیشہ پہلے آتا ہے اور

لفظ بعد میں، خواہ فوراً ہی بعد آئے...... جس کے تاخر کو ہم محسوس نہیں کر سکتے...... یا ذرا وقفے کے بعد محسوس بھی کیا جا سکے۔

خیال بلا لفظ

بعض اوقات اب بھی ایسا ہوتا ہے کہ دماغ میں خیالات کا پیکر چکر کاٹتا رہتا ہے لیکن اس کے اظہار کے لیے لفظ نہیں ملتے۔ یہ بالکل مجرد خیالات ہوتے ہیں اور ان دماغوں میں بھی آتے ہیں جو ابھی لفظ ''لفظ'' سے بھی آشنا نہیں ہوتے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اول

چھوٹا بچہ کسی لفظ سے آشنا نہیں ہوتا لیکن ہلکے پھلکے خیالات اس کے دماغ میں بھی آتے رہتے ہیں۔ اس سے آگے اور بڑھیے تو آپ دیکھیں گے کہ گونگا کسی لفظ سے واقف نہیں ہوتا لیکن وہ تمام جذبات و کیفیات جو آپ کے دماغ میں لفظوں کے ساتھ آتے ہیں اس کے دماغ میں بھی بہ شکل خیالات آتے رہتے ہیں۔

دوم

اس وقت بھی جبکہ ہم آپ الفاظ کا خزانہ اپنے دماغ میں رکھتے ہیں، یہ حال ہے کہ ہر روز نئی نئی اصطلاحات نکلتی چلی آتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اصطلاحیں بہ شکل الفاظ بعد کی پیداوار ہیں اور اس کا سبب وہ خیالی مفہوم ہے جس کے لیے کوئی لفظ پہلے سے موجود نہ تھا۔ ضرورت اظہار اس صطلاح کے ایجاد ہونے کا سبب بنی۔

سوم

آپ کو بارہا تجربہ ہوا ہوگا کہ آپ کچھ لکھنا یا کہنا چاہتے ہیں لیکن اسے فی الفور نہیں ادا

کر سکتے۔ ایک ایک موزوں لفظ کی تلاش میں پہروں گزر جاتے ہیں بعض اوقات کئی کئی دن گزر جاتے ہیں۔ اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ ایک پیکر خیال دماغ میں چکر کاٹتا رہتا ہے مگر وہ عریاں اور مجرد ہوتا ہے اور اسے الفاظ کا جامہ پہنانے کی نوبت بعد میں آتی ہے۔

چہارم

بے شمار خیالات، تصورات، احساسات اور کیفیات ایسی ہیں جن کے اظہار کے لیے اب تک آپ کے پاس الفاظ موجود نہ ہوں گے، نہ موزوں نہ غیر موزوں۔ ''عشق'' ایک بالکل محسوس کیفیت ہے۔ ایک گونگے کے لیے، لیکن اس مفہوم کے لیے کوئی لفظ اس کے دماغ میں موجود نہیں۔ بالکل اسی طرح بہت سی کیفیات اب بھی ایسی موجود ہیں جن کے اظہار سے ہم ہنوز اسی طرح عاجز ہیں جس طرح گونگا۔

پنجم

ترشی اور شیرینی دو الگ الگ محسوس کیفیتیں ہیں اور ان دونوں کا فرق بھی ایک حقیقت ہے لیکن اس ''نفسِ فرق'' کے لیے اب تک کوئی لفظ آپ کے پاس موجود نہیں۔ اسی طرح محبتیں بیسیوں قسم کی ہوتی ہیں لیکن اب تک دنیا میں کوئی لفظ ایسا ایجاد نہیں ہوا ہے جو اولاد کی محبت کو دوسری اقسام محبت سے ممتاز کر کے بے اولادوں کو بھی محبت اولاد کی حقیقت سمجھا دے۔ ایک نا آشنائے لفظ گونگا بھی اولاد کی محبت میں وہی شدت رکھتا ہے جو آپ رکھتے ہیں۔ بلکہ ایک قدم آگے بڑھیے تو ایک جانور بھی محبت اولاد کی وہی کیفیت اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ مگر اس تصور یا کیفیت کے اظہار کے لیے ایک صحیح لفظ سے سب محروم ہیں۔ گونگا بھی، آپ بھی اور حیوانات بھی۔ اب آپ اگر لفظ تلاش کریں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ

یہ تصور وخیال دماغ میں پہلے آیا اور لفظ کی تلاش بعد میں ہوئی۔

ششم

فرض کیجیے آپ رنگون پہنچ کر ایک ایسا پھل کھاتے ہیں جو آپ نے اس سے پہلے کبھی نہیں کھایا تھا۔ ہاتھ سے چھوتے ہیں، آنکھوں سے اس کی شکل و رنگت دیکھتے ہیں، ناک سے اس کی خوشبو سونگھتے ہیں، کانوں سے اس کے چرنے کی آواز سنتے ہیں، زبان سے اس کا مزہ چکھتے ہیں اور قویٰ سے اس کی تاثیر اور فرحت محسوس کرتے ہیں۔ غرض تمام جہات ستہ سے اس کا خیال، تصور اور احساس سب کچھ موجود ہے لیکن دیکھیے:

خیال وتصور موجود ہونے کے باوجود ابھی تک یہ نہیں معلوم کہ اسے کہتے کیا ہیں۔ اس کا کیا نام ہے؟ دو سال کا بچہ ہو یا گونگا یا آپ جیسا فصیح البیان، سب اس کا تصور و خیال یکساں اپنے دماغ میں رکھتے ہیں لیکن ابھی تک آپ کو یہ نہیں معلوم کہ وہ کون سا لفظ ہے جو اس پھل کی تمام کیفیات محسوسہ کا آئینہ دار ہو۔ ہاں جب آپ کو یہ بتایا جاتا ہے کہ اسے ''دریان'' کہتے ہیں تو پھر آپ کو اس کے تمام مجموعی خیال وتصور کے لیے ایک لفظ ہاتھ آجاتا ہے۔ اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ خیال پہلے اور لفظ بعد میں آتا ہے اور لفظ بھی ایسا جو بچہ رفتہ رفتہ سیکھتا ہے، گونگا آخر وقت تک نہیں سیکھ سکتا، اور خود آپ کا یہ حال ہوتا ہے کہ بعض اوقات اس لفظ کو بھول جاتے ہیں اور دیر تک اس طرح سوچتے ہیں کہ...... وہ کون سا پھل تھا جو ہم نے فلاں سنہ میں رنگون میں کھایا تھا؟...... کیا نام ہے اس کا...... اس کے آخر میں غالباً ''نون'' ہے...... کچھ ''جاپان'' کے وزن پر ہے...... عریان کا ہم قافیہ ہے...... ہاں یاد آگیا...... اسے ''دریان'' کہتے ہیں۔ ''دریان''...... دریان خوب یاد آیا۔ دیکھیے پیکر خیال موجود ہے مگر...... لفظ دریان سے عریاں۔ دیر کے بعد اسے جامہ لفظ پہننا نصیب ہوتا ہے۔

اگر ساری عمر یہ لفظ نہ بتایا جائے تو ہم ایک مجرد خیال اور ناشرمندہ تعبیر تصور لے کر دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ اور اگر ہم خود اب اس کے لیے کوئی لفظ وضع کریں تو بھی یہ دلیل ہو گی تصور کے تقدم اور تلفظ کے تاخر کی۔

ہفتم

اگر لفظوں کے بغیر کبھی خیال نہ آیا کرے تو مافی الضمیر کے اظہار کے لیے کبھی سوچنا نہ پڑے۔ بس قلم اٹھایا اور بے تکان لکھنا شروع کر دیا۔ مگر بڑے بڑے زود نویس مصنفین کو بھی کہیں کہیں اٹکنا پڑتا ہے بلکہ بہت سے بولنے والوں کو بھی آپ نے دیکھا ہو گا جو لفظوں کی تلاش میں اٹک اٹک کر بولتے ہیں۔ مانا کہ ان کے خیالات میں الجھن ہوتی ہو گی لیکن بہر حال وہ ہوتے ہیں خیالات ہی جن کو ادا کرنے کے لیے تلاش الفاظ کی کامیابی بعد میں ہوتی ہے۔

ہشتم

ایک اور حقیقت پر غور کیجیے۔ ایک شخص کی گود میں آگ کا شعلہ گرتا ہے اور وہ ایک سیکنڈ گزرنے سے پہلے اپنا دامن جھٹک کر شعلے کو پھینک دیتا ہے...... ظاہر ہے کہ دامن جھٹکتے وقت اس کے دماغ میں یہ الفاظ کبھی نہیں آتے کہ...... ''یہ آگ کا شعلہ ہے جس کی خاصیت ہے جلانا، یہ ہمارے کپڑے کو جلا دے گا، اگر ہم نے اس کو جھٹکنے میں تاخیر سے کام لیا تو ہمارا کپڑا بھی جل جائے گا اور جسم کو بھی اذیت پہنچے گی، لہٰذا خیریت اسی میں ہے کہ اسے جلد سے جلد جھٹک کر الگ کر دیا جائے تاکہ ہم نقصان سے محفوظ رہیں'' ...... ان منطقی مقدمات کا ایک لفظ بھی اس کے ذہن میں نہیں آتا۔ اگر اس طرح ترتیب وار الفاظ اس کے دماغ میں آئیں اور اس کے بعد وہ دامن کو جھٹکے تو اس وقت تک خدا جانے کیا سے کیا ہو جائے۔ اس

کے دماغ میں تو لفظ ''خطرہ'' بھی نہیں آتا بلکہ ان تمام خطرات اور منطقی مقدمات کا محض ایک مجموعی خیال اور مجرد تصور انتہائی سرعت و تیزی کے ساتھ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں آ جاتا ہے اور فوراً وہ اس پر عمل کر گزرتا ہے۔ اگر خطرات کا یہ مسلسل تصور الفاظ کے ساتھ آئے تو کم از کم دس سیکنڈ لگیں گے اور اس وقت تک اس کا کپڑا جل کر جسم کی چربی بھی نکل چکے گی۔ اس قسم کے اچانک خیالات جتنے بھی آتے ہیں وہ الفاظ سے مجرد ہو کر آتے ہیں۔ جب ان کا اظہار کیا جاتا ہے تو الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائے جاتے ہیں۔

نتیجہ

یہ تمام باتیں یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ انسان کے دماغ میں ایسے خیالات بھی اچانک آ جاتے ہیں جن کے لیے پہلے سے الفاظ نہیں معین ہوتے بلکہ اس خیال کا اظہار بعد میں بہ شکل الفاظ کیا جاتا ہے۔ یہاں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس مقام پر انسان گویا حیوانات یا گونگے یا بچے کی سطح پر ہوتا ہے کہ دماغ میں خیالات محضہ ہوتے ہیں لیکن مجرد عن الالفاظ۔ یہ واقعہ ہے کہ ہم کچھ شعور آنے کے بعد بتدریج ان الفاظ سے آشنا ہوئے ہیں لیکن دماغ پہلے سے رکھتے ہیں جو کسی وقت بھی خیالات سے خالی نہیں رہ سکتا۔ اسی ''دماغی تقدم'' کا تقاضا ہے کہ اب بھی الفاظ سے آشنا ہو چکنے کے باوجود بعض اوقات یہ صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ دماغ میں یکایک کوئی خیال تو آ جاتا ہے لیکن الفاظ کا جامہ بعد میں پہنتا ہے۔

مرکز بحث کی طرف رجوع

پچھلے صفحوں میں ہم ''مسئلے کی نزاکت'' کے عنوان کے تحت یہ بیان کر چکے ہیں کہ وحی انبیا پر بھی آتی ہے اور اولیا پر بھی اور دونوں کو اپنی اپنی وحیوں پر قریباً یکساں یقین ہوتا ہے،

کیونکہ دونوں خدا کی طرف سے ہی ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود دونوں میں بڑا فرق ہے اور اسی فرق کو واضح کرنے کے لیے ہمیں یہ تصریح کرنی پڑی ہے کہ...... انسان کے دماغ میں جو خیالات آتے ہیں وہ بغیر الفاظ کے بھی آتے ہیں اور الفاظ کے ساتھ بھی۔ بس یہی فرق ہے۔ اولیا اور انبیا کی وحیوں میں، اولیا پر جو کچھ القا کیا جاتا ہے وہ بلا لفظ ہوتا ہے اور انبیا پر الفاظ کے ساتھ۔ وہاں صرف مفہوم ہوتا ہے جس کے لیے الفاظ بعد میں تلاش کیے جاتے ہیں اور یہاں الفاظ ہی ہوتے ہیں جن کے معنی بعد میں سمجھے جاتے ہیں۔

صرف مفہوم کی وحی

صرف مفہوم کی وحی اولیا پر بھی ہوتی ہے اور انبیا پر بھی۔ اس وقت ایک پیغمبر اسی طرح ایک ولی کی سطح پر ہوتا ہے جس طرح ایک ولی تکوینی وحی میں مگس شہد کی سطح پر ہوتا ہے لیکن اس اشتراک کے باوجود جس طرح ایک ولی مگس سے ایک بلند تر وحی کا بھی حامل ہوتا ہے، اسی طرح ایک نبی اولیا سے ایک بالاتر وحی کا بھی مہبط ہوتا ہے۔ دیکھیے مگس کو ان الفاظ کی وحی نہیں ہوتی کہ......

> أَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوتاً وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُونَ ـ ثُمَّ کُلِیْ مِن کُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلاً (١٦:٦٨،٦٩)
>
> پہاڑوں، درختوں اور عمارتوں پر اپنا چھتا بنا، پھر ہر پھل سے رس چوس لے، پھر اپنے رب کے معین راستوں پر انقیاد کے ساتھ چل پڑ۔

شہد کی مکھی پر یقیناً یہ الفاظ وحی نہیں ہوتے بلکہ محض اس کا ایک مفہوم اس کے ننھے سے دل میں تکوینی طور پر ڈال دیا جاتا ہے۔ اسی طرح حضرت یوکبد (ام موسیٰ) پر یہ الفاظ نہیں نازل ہوئے کہ

> أَنِ اقْذِفِیْهِ فِیْ التَّابُوتِ فَاقْذِفِیْهِ فِیْ الْیَمِّ (٢٠:٣٩)

کہ تو اسے صندوق میں بند کر کے سمندر میں ڈال دے۔

اور نہ یہ الفاظ وحی کیے گئے کہ

لَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ اِنَّا رَادُّوْہُ اِلَیْكِ وَجَاعِلُوْہُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (۲۸:۷)

تو خوف وحزن نہ کر، ہم اسے تیری طرف لوٹا دیں گے اور اسے رسول بنائیں گے۔

ان الفاظ میں سے کوئی حرف یا لفظ جناب یوکبد پر نازل نہیں ہوا، بلکہ اس کا مفہوم خیال کی شکل میں دل و دماغ کے اندر پوری سرعت کے ساتھ پیوست کر دیا گیا۔ جناب یوسف کے ساتھ بھی (قبل از نبوت) یہی ہوا کہ آئندہ پیش آنے والے تمام واقعات کا ایک اجمالی تصور ایک لمحے میں سامنے آ گیا جس کا خلاصہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

وَاَوْحَیْنَا اِلَیْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُم بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ (۱۲:۱۵)

ہم نے یوسف کی طرف وحی کی کہ تم اپنے بھائیوں کو یہ بات بتا کے رہو گے۔

جناب یوسف پر یہ الفاظ یعنی

"لتنبئنھم بامرھم ھذا......الخ

نہیں نازل ہوئے بلکہ اس کا محض ایک مفہوم القا کر دیا گیا۔ یوں ہی حواریان مسیح کی طرف یہ الفاظ نہیں وحی ہوئے کہ:

اَنْ آمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ (۵:۱۱۱)

مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ۔

بلکہ یہاں بھی صرف اس جملے کا مفہوم القا کر دیا گیا۔

اولیائی وحی کی اصلی نوعیت

ایسا بھی ممکن ہے کہ کبھی کوئی خاص لفظ بھی اولیا اللہ پر نازل ہو جاتا ہو جبکہ لفظ ہی کی

ضرورت ہو اور اس کے بغیر کام نہ چل سکتا ہو۔ اس کا بھی امکان ہے لیکن اصالتاً ان کی وحی الفاظ سے مجرد اور خیالات محضہ ہوتی ہے۔ یہ ایک کیفیت اور ایک خیال ہے جو پوری سرعت رفتار کے ساتھ دل میں ڈال دیا جاتا ہے اور الفاظ کا جامہ بعد میں پہنتا ہے۔ اوپر کی بحثوں میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ خیال بلا لفظ عام انسانوں کے دماغ میں بھی آتے ہیں۔ پس اجمالی طور پر اتنا سمجھ لیجیے کہ اسی طرح کی کوئی چیز جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی مقرب بندے پر القا کی جاتی ہے اور وہ الفاظ سے قطعاً مجرد اور خالی ہوتی ہے تو اسی کو کہتے ہیں ''الہام'' (یہ اصطلاح قرآنی نہیں بلکہ ''وضو'' کی طرح کی ایک اصطلاح ہے)

نبوی وحی کی خصوصیت

اولیائی وحی کی نوعیت معلوم کرنے کے بعد پیغمبری وحی کی نوعیت خود بخود سامنے آجاتی ہے، گویا ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ولی پر جو وحی ہوتی ہے وہ غیر ملفوظ ہوتی ہے اور پیغمبر پر ملفوظ وحی ہوتی ہے، لیکن آگے بڑھنے سے پہلے ایک ضروری چیز کو یہیں صاف کرتے چلیے۔ اور وہ یہ ہے کہ پیغمبری وحی کے ملفوظ ہونے کے یہ معنی قطعاً نہیں کہ پیغمبر غیر ملفوظ وحی سے خالی ہوتا ہے۔ اگر ہم انسان کو ناطق کہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ متحرک بالارادہ نہیں۔ ناطق ہونے کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ عام حیوانات کی طرح متحرک بالارادہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک مزید وصف نطق بھی رکھتا ہے یوں ہی سمجھئے کہ پیغمبر کے ''صاحب وحی ملفوظ'' ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ عام اولیا کی طرح غیر ملفوظ وحی کا بھی یقیناً حامل ہوتا ہے۔

مبحث سوم

وحی سے تعلق رکھنے والی اصطلاحیں

وحیوں کے لیے اصطلاحات

اولیا کے لیے "الہام" کی اصطلاح ایک مشہور چیز ہے۔ اس کے لیے یہی موزوں ترین لفظ ہے لیکن پیغمبروں کی وحی دو طرح کی ہوتی ہے، اور ان دونوں کے لیے الگ الگ لفظ وضع کیے گئے ہیں۔ جس وحی میں اولیا کا بھی اشتراک ہے اس کے لیے وحی خفی اور وحی غیر متلو کا لفظ وضع کیا گیا ہے اور جس وحی میں کسی غیر نبی کا اشتراک نہیں اسے وحی متلو اور وحی جلی کہتے ہیں۔

نئی اصطلاح

اس میں شک نہیں کہ......وحی کا لفظ دونوں کے لیے لغۃً صحیح ہے لیکن اپنی زبان میں اسے اچھی طرح ممتاز کرنے کے لیے زیادہ مناسب و موزوں اور اقرب الی القرآن دوسرے دو لفظ ہیں۔ یعنی "الہام" اور "تنزیل" لفظ وحی اگرچہ ان دونوں کے لیے بولا جا

سکتا ہے، لیکن مناسب یہ ہے کہ جب بھی لفظ وحی بولا جائے تو اس سے صرف تنزیل ہی سمجھی جائے جس کے لیے قدیم اصطلاح جلی یا متلو ہے۔ اس لیے اب ہم آئندہ جب......

۱۔ ''الہام'' کہیں تو اس سے صرف وہ ''خیال'' سمجھیے جو خدا کی طرف سے القا کیے جائیں۔

۲۔ ''تنزیل'' بولیں تو اس سے صرف وہ ''الفاظ'' سمجھیے جو خدا کی طرف سے نازل ہوں۔

۳۔ ''وحی'' لکھیں تو اس سے بھی تنزیل ہی مراد ہوگی (اگرچہ اس کا اطلاق الہام پر بھی غلط نہیں)

نبوی وحی کا امتیاز

گزشتہ تصریحات سے آپ ضرور اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ:

۱۔ اولیا اللہ پر صرف ایک قسم کا القا ہوتا ہے جسے ہم الہام کہتے ہیں۔

۲۔ انبیائے کرام پر تین قسم کی وحی ہوتی ہے۔ صرف الہام، فقط تنزیل اور دونوں ایک ساتھ۔

یہ ہے نبوی وحی کا امتیاز جو ایک نبی کو ولی سے الگ کرتا ہے۔ یعنی ولی کو صرف الہام ہوتا ہے لیکن نبی کو الہام بھی ہوتا ہے اور ایک قسم کی وحی اور بھی ہوتی ہے جو کسی غیر نبی، کسی ولی اور کسی مقرب پر نہیں ہوتی، اسی کو تنزیل کہتے ہیں اور یہ وہ ''فصل'' ہے جو پیغمبر کو صاحب الہام اولیا سے ممتاز کرتی ہے، یہی تنزیل ہے جہاں مفہوم سے پہلے ''الفاظ'' القا کیے جاتے ہیں اور معنی کا تعین اس وحی سے تعلق نہیں رکھتا۔ اور الہام صرف ایک مفہوم ہوتا ہے جس کے اظہار کے لیے تلاش الفاظ خارج از الہام ہوتی ہے۔

تنزیل کی اصطلاح

تنزیل کی اصطلاح کچھ ہماری اپنی ایجاد نہیں بلکہ قرآن کریم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ مخصوص طور پر اس وحی کے لیے ہے جسے ملفوظ یا جلی یا متلو وغیرہ کہا جاتا ہے۔ ویسے تو انزال و تنزیل اور اس کے مشتقات قرآن پاک میں ماء (پانی) سکینہ (اطمینان)، امنہ (سکون)، سلطان (سند)، مائدہ (خوان)، نور (روشنی)، ملک (فرشتہ)، کنز (خزانہ)، جنود (لشکر)، انعام (چوپائے)، خیر (دولت یا نیکی)، لباس (پوشاک)، رجز (نجس وعذاب)، من وسلویٰ (من اور بٹیر)، حدید (لوہا) وغیرہ سب کے لیے آئے ہیں لیکن ہمیں اس وقت ان چیزوں سے بحث نہیں۔ ہمارا موضوع بحث وہ ''ماانزل اللہ'' ہے جو وحی کے لیے آیا ہے جو ملفوظ ہو یا مکتوب ہو نہ کہ محض مفہوم یا خیال۔ قریباً ڈیڑھ سو مقامات پر قرآن پاک میں یہ لفظ فرقان، قرآن، کتاب، تورات، انجیل، سورہ، آیت وغیرہ کے لیے آیا ہے اور ہر جگہ اس سے وحی مکتوب وملفوظ ہی مراد ہے (پچھلے صفحوں میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ لفظ وحی میں کتاب کا مفہوم بھی موجود ہے) اس لیے اقرب الی القرآن اصطلاح یہی ہے کہ وحی ملفوظ اور وحی جلی اور وحی متلو وغیرہ کی بجائے ''تنزیل'' کہا جائے۔ قرآن پاک میں اسی مفہوم کے لیے لفظ ''القا'' کے صیغے بھی آئے ہیں۔ مثلاً

وَإِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ (۲۷:۶)......

إِنِّي أُلْقِيَ إِلَيَّ كِتَابٌ كَرِيمٌ (۲۷:۲۹)......

ہم نے سہولت تفہیم کے لیے صرف دو ہی لفظ منتخب کیے ہیں۔ الہام اور تنزیل (یا وحی)۔

تنزیل اورالہام کے مقاموں کا فرق

بہ ظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ تنزیل والہام میں کوئی اتنا بڑا فرق نہیں جتنا نبی اور ولی میں ہے۔ یعنی ملفوظ اور غیر ملفوظ کا فرق اس درجے باہم متفاوت نہیں معلوم ہوتا جس سے نبی اور ولی کے مقاموں کا عظیم الشان فرق نمایاں ہو سکے لیکن ہم مادی دنیا میں رہ کر ان دونوں کے روحانی مرتبہ ومقام کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ خاموش رہنے اور دو چبھتے ہوئے لفظ کہہ دینے میں فرق ہے۔ چپ رہنے اور پیار کی دو باتیں کر دینے میں عظیم الشان تفاوت ہے۔ سکوت اور حکم ایک درجہ نہیں رکھتے۔ دل کی باتیں سمجھ لینے کے باوجود اس فہم کا وہ مقام ومرتبہ نہیں ہوتا جو زبانی یا تحریری گفتگو کا ہوتا ہے۔ ہم سو مثالیں دے کر بھی تنزیل اور الہام کے فرق وامتیاز کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ ہمیں صرف اتنا علم ہے کہ اس تنزیل کا بوجھ اتنا کچھ ہوتا ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی پر سوار ہیں اور وحی نازل ہونے لگی ہے تو اونٹنی چلنے پر بلکہ کھڑے رہنے پر قادر نہ رہ سکی اور بیٹھ گئی ہے...... اگر اس تنزیل کے وقت علی مرتضیٰ کے زانو پر سر مبارک رکھا ہے تو ایسا محسوس ہوا کہ زانو کو کوئی توڑے ڈالتا ہے۔ اگر شدید سردی میں بھی وحی تنزیل اتری ہے تو رسول کا چہرہ متغیر ہو گیا ہے اور پسینہ چھوٹنے لگا ہے...... یہی وہ تنزیل ہے جس کے بوجھ کا تصور بھی پہاڑوں کی کمر توڑنے کو کافی تھا۔

لَوْ أَنزَلْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ

(۵۹:۲۱)

یہی وہ تنزیل ہے جس کا بوجھ اٹھانے کے لیے موسیٰ کلیم اللہ کی تنہا نبوت کو کافی نہ سمجھا گیا بلکہ چالیس راتیں مسلسل تصفیہ وتزکیہ کرایا گیا۔ یہی وہ تنزیل ہے جس کے پہلے تجربے

کے بعد محمد عربی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ غار حرا سے واپس آئے تھے اور اپنی زندگی تک سے مایوس ہو گئے تھے...... تمام رُوئے زمین کے اولیا اللہ بھی مل کر اس تنزیل کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ یہ صرف پیغمبر ہی کا ظرف ہے جو اس بوجھ (تنزیل) کو اٹھا لیتا ہے۔ یہی تنزیل ہے جو انبیا کو اولیا سے اسی طرح ممتاز کر دیتی ہے جس طرح اولیا کو ان کا الہام ربانی مگس شہد کی تکوینی وحی سے الگ کرتا ہے۔

بازگشت

ربط کلام کے لیے اس چیز کو پھر سامنے لے آیئے کہ اولیا کو صرف الہام (غیر ملفوظ وحی) ہوتا ہے اور انبیا کو دونوں الگ الگ بھی ہوتے ہیں اور ایک ساتھ بھی، اس حقیقت کو ہم تین مثالوں سے سمجھ سکتے ہیں۔

نبوی وحی کی مثال اول

ایک شخص خواہ گونگا ہو یا گویا، آپ کو ایک اشارہ کرتا ہے جسے آپ پہلے نہیں سمجھتے کہ اس کا مقصد کیا ہے لیکن ذرا توقف اور معمولی غور کے بعد آپ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ فلاں بات کہہ رہا ہے۔ اس اشارے سے اس نے آپ پر اپنے مقصد کا محض القا کیا، الفاظ نہیں القا کیے۔ الفاظ میں مَیں آپ ادا کرتے ہیں مفہوم سمجھ لینے کے بعد۔

دوسری مثال

آپ کسی سے کہتے ہیں کہ ''کمر باندھ لو'' یہ سننے کے بعد سامع خود ہی موقع و اقتضا سے مطلب متعین کرتا ہے کہ آیا آپ نے اسے درد کمر کا علاج بتایا ہے یا کسی کام کی تیاری کا حکم دیا ہے۔ یہاں دیکھیے آپ نے صرف الفاظ القا کیے جن کا مفہوم و معنی خود سامع متعین کرتا ہے۔

تیسری مثال

آپ نے اپنی یا سامع کی کمر کی طرف (لپیٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے) کہا کہ "کمر باندھ لو" تو یہاں معنی کی تخصیص ہو جائے گی کیونکہ آپ نے لفظ اور مفہوم، خواہ وہ وقتی ہو دونوں ہی القا فرما دیئے۔

مطابقت

پیش کردہ مثالوں میں سقم ہوسکتا ہے۔ مثال کی صحت پر اصرار نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال ان مثالوں سے صرف اتنا واضح کرنا مقصود ہے کہ:

ا۔ اولیا کو صرف ایک طرح کی وحی ہوتی ہے جسے الہام کہتے ہیں۔ یہ مجرد خیال ہوتا ہے، لفظوں کی شکل بعد میں اختیار کرتا ہے۔

۲۔ پیغمبر کو تین طرح کی وحی ہوتی ہے:

الف۔ صرف مفہوم اور مجرد خیال، جسے پیغمبر اپنے الفاظ میں ادا کرتا ہے۔

ب۔ صرف الفاظ جس کے مفہوم کو پیغمبر اپنی خداداد بصیرت سے متعین کرتا ہے۔

ج۔ دونوں کا مجموعہ۔ نور علیٰ نور

تعین معنی میں پیغمبری لغزش

یہ آپ معلوم کر چکے کہ پیغمبری وحی کی دوسری قسم ہے صرف الفاظ۔ ایسے موقعے پر اس کی تفسیر کو پیغمبر کی غیر معمولی بصیرت و اجتہاد پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کیونکہ پیغمبری بصیرت کی سرحدیں بھی وحی ربانی کی سرحدوں سے قریب تر ہی ہوتی ہیں، لیکن یہ عین ممکنات میں ہے کہ اس غیر معمولی بصیرت نبوی سے تفسیر و تعیین معنی میں بہ تقاضائے بشری لغزش ہو جائے۔ یہ بالکل ممکن ہے لیکن پیغمبر کو اس لغزش پر قائم نہیں رہنے دیا جاتا۔ جلد سے جلد اس کی اصلاح

کر دی جاتی ہے۔ اپنی بساط کو دیکھتے ہوئے مثال پیش کرنے کی جسارت نہیں ہوتی لیکن بحمد للہ نیت صاف اور مثال قرآن پاک میں ہے۔ سیدنا نوحؑ نے بارگاہ الٰہی میں فریاد کی کہ

إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ (۱۱:۴۵)

تیرا وعدہ (مجھے اور میرے اہل کو نجات دلانے کے متعلق) سچا ہے اور میرا فرزند بھی میرے ''اہل'' ہی میں ہے۔

حضرت نوحؑ اپنے فرزند کو بھی اہل میں سمجھ رہے تھے۔ یہ تعیین معنی منشائے الٰہی کے مطابق نہ تھی۔ اس نے فوراً یہ فرما کر اصلاح کر دی کہ:

إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ (۱۱:۴۶)

وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔

اس قسم کی اصلاحیں کبھی تو غلط فہمی کے بعد کی جاتی ہیں اور کبھی غلطی کے امکان کو روکنے کے لیے ساتھ ہی ساتھ خواہ تنزیلاً ہو یا الہاماً۔

لغزش کی اس مثال سے واضح ہوتا ہے کہ تنزیل کے وقت تعیین مفہوم کا نزول ضروری نہیں۔ اگر ہر تنزیل کے وقت خدا کی طرف سے مفہوم بھی متعین کر دیا جاتا تو سیدنا نوحؑ سے یہ لغزش نہ ہوتی۔ پس ایک پیغمبر پر جس طرح تنزیل الفاظ بلا تعیین معنی ہوتی ہے اسی طرح الہام معنی بلا تعیین الفاظ بھی ہوتا ہے اور دونوں کا مجموعہ بھی ہو سکتا ہے۔

تنزیل والہام کا فرق

پچھلے صفحوں میں ہم نے ''مسئلے کی نزاکت'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ ولی و نبی کی وحیوں میں بڑا فرق ہے۔ اب تک ہماری تفصیلات سے صرف ایک فرق واضح ہو سکا ہے یعنی ولی کو صرف الہام (وحی غیر لفظی) ہوتا ہے اور پیغمبر کو تنزیل (لفظی)، الہام اور دونوں کا مجموعہ، تینوں طرح کی وحی ہوتی ہے۔

دوسرا فرق

دوسرا فرق الہام و تنزیل میں یہ ہے کہ تنزیل کی تبلیغ و ابلاغ (دوسروں تک پہنچا دینا) ضروری ہے۔ اس کے بغیر فرائض رسالت پورے ہی نہیں ہوتے، جیسا کہ ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ (۵:۶۷)

اے رسول جو کچھ تم پر نازل ہوا اُسے پہنچا دو، اور اگر یہ نہ کیا تو تم نے مقصد رسالت کو پورا نہ کیا۔

بخلاف اس کے الہام کا ابلاغ نہ فرائض رسالت میں داخل ہے نہ فرائض ولایت میں۔

دیکھیے حضرت یوکبد کو الہام تو ہوا تھا لیکن اس کی تبلیغ کا کوئی حکم نہ تھا، بلکہ یوں کہیے کہ عدم تبلیغ اور اخفا ضروری تھا۔ کیا کوئی عقل کی بات ہوتی، اگر حضرت یوکبد ہر شخص کو کہتی پھرتیں کہ مجھے موسیٰؑ کو صندوق میں بند کر کے سمندر میں ڈال دینے کی ہدایت ہوئی ہے، لہٰذا اے عورتو! تم بھی ایسا ہی کیا کرو؟ اور کیا جناب یوسفؑ کے لیے یہ مناسب تھا کہ وہ اپنے بھائیوں سے پھر اہل قافلہ سے پھر سارے مصریوں سے یہ کہتے پھرتے کہ مجھے کنوئیں میں گرتے وقت یوں الہام ہوا ہے: ''تم اپنے بھائیوں کو ان کی سازش مکر سے آگاہ کرو گے۔''

تیسرا فرق

اوپر کی مثال سے تیسرا فرق خود بخود نکل آتا ہے کہ الہام ایک انفرادی القا ہوتا ہے یا اس کا حلقہ بہت ہی محدود اور تنگ ہوتا ہے اور تنزیل ہوتی ہے ساری قوم کے لیے۔

چوتھا فرق

اس فرق کی جو وجہ ہے وہی چوتھا فرق ہے یعنی یہ عین ممکن ہے کہ کسی الہام کا کوئی تعلق ہدایت خلق سے نہ ہو جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے واضح ہے۔ لیکن تنزیل کا سراسر تعلق ہدایت خلق سے ہوتا ہے یعنی تنزیل تو عین جزو دین ہوتی ہے اور الہام کا جزو دین ہونا ضروری نہیں۔

پانچواں فرق

یہ بھی ممکن ہے کہ الہام ایک بالکل رازدارانہ (Confidential) چیز ہو جس کے ابلاغ کا نہیں بلکہ اخفا ہی کا حکم ہو لیکن تنزیل عدم اخفا اور بالاعلان تبلیغ کی چیز ہے کیونکہ اس کا تعلق پورے اجتماعی زندگی کے نظام سے ہے۔

چھٹا فرق

ولی کا الہام حجت نہیں لیکن نبی کی تنزیل حجت کے سوا اور کچھ نہیں۔ یعنی الہام اسی کے لیے حجت ہے جس پر الہام ہو، لیکن تنزیل ہر مخاطب کے لیے حجت قطعی ہے اور ہر حجت سے بڑھ کر آخری حجت۔

ساتواں فرق

دونوں میں ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ تنزیل کا پیغمبر دعویٰ کرتا ہے اور اس کا منکر کافر ہے، لیکن اولیا کا الہام کوئی دعوے کی چیز نہیں۔ نہ اس پر ایمان لانا ضروری ہے اور نہ اس کا منکر کافر ہو سکتا ہے۔

اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے الہام اور تنزیل کی سرحدیں بالکل واضح طور پر الگ ہوتی ہیں۔

مبحث چہارم

وحی کی متفق علیہ اور مختلف فیہ قسمیں

پیغمبر اور الہام

اوپر کے بیان میں جا بجا اس چیز کی تکرار ہوئی ہے کہ پیغمبر صرف حامل تنزیل (وحی) نہیں ہوتا بلکہ یقیناً وہ حامل الہام بھی ہوتا ہے۔ اس الہام سے ہمارا کتنا بھر تعلق ہے، اور پیغمبر اس کے ابلاغ پر کس حد تک مامور ہے، اس کی بحث انشا اللہ آگے آئے گی۔ ابھی تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا اس کا کوئی ثبوت بھی ہے؟ پیغمبری تنزیل تو ایک ایسی وحی ہے جس میں کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش ہی نہیں، لیکن دوسری قسم وحی یعنی الہام کا وجود ایک مختلف فیہ چیز ہے۔ ہم نے جہاں تک غور کیا ہے اس کے وجود کے لیے دلائل پیش کیے جا سکتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کو بھی اس قسم (الہام پیغمبری) کا علم تھا۔ مندرجہ ذیل باتوں پر غور کیجیے:

پہلی دلیل

ہم آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن جملۃً واحدۃً اور یکبارگی نازل نہیں ہوا۔ یہ بھی مانتے ہیں کہ موجودہ ترتیب (جس کو ترتیب تلاوت کہتے ہیں) اس ترتیب سے نہیں جو نزول کی ترتیب تھی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ترتیب نزول اور ہے اور ترتیب تلاوت اور۔ تنزیلی ترتیب کا تقاضا تو یہ تھا کہ سورہ علق پہلے ہوتی اور سورہ نصر سب سے آخر میں، یا کم از کم پہلے تمام مکی سورتیں ہوتیں پھر مدنی سورتیں، اور صرف سورتوں ہی میں نہیں بلکہ آیات میں بھی اسی طرح کی زمانی ترتیب ہوتی۔ لیکن جس ترتیب سے آج آپ کے ہاتھوں میں قرآن ہے وہ اس سے یکسر جداگانہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ سور و آیات کی یہ ترتیب کس نے دی اور کیوں؟ یہ تو آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ موجودہ ترتیب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی ہے جو سورت یا آیت نازل ہوتی حضورؐ سے بتادیتے کہ فلاں جگہ لکھو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ترتیب خود حضورؐ کی اپنی عقل و بصیرت سے تھی یا وحی سے؟ اگر وحی سے تھی...... اور وحی صرف ایک یعنی تنزیل ہی ہے...... تو قرآن میں اس ترتیب کا ذکر کہاں ہے؟ اور اگر حضور نے اپنی بصیرت و اجتہاد سے یہ ترتیب قائم فرمائی تو یہ ماننا پڑے گا کہ کم از کم یہ ترتیب غیر الٰہی ہے اور ''ما انزل اللہ'' کے مطابق نہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ قرآن کے متعلق آپ کی نزاکت احساس غیر الٰہی ترتیب ہونے کا تصور برداشت نہ کر سکے گی۔

مگر اس سوال کا حل کیا نکلا؟ یعنی ہم نہ تو اسے غیر الٰہی ترتیب ماننے کو تیار ہیں اور نہ الٰہی ترتیب ہونے کا کوئی ثبوت تنزیل میں موجود ہے۔ پھر یہ ترتیب کہاں سے اور کس طرح قائم ہوگئی؟ ہم سمجھتے ہیں کہ اس مشکل کا حل یہی ہے کہ یہ ترتیب نہ تو حضورؐ نے اپنی بصیرت و اجتہاد سے قائم فرمائی اور نہ تنزیل نے یہ ترتیب بتائی بلکہ یہ سب کچھ الہام سے ہوا۔

دوسری دلیل

اس بات کے ثبوت میں کہ ہر قول رسول واجب الاطاعت نہیں، یہ واقعہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ میدان بدر کی جس فرودگاہ کو حضورؐ نے پسند فرمایا اس کے متعلق حبابؓ بن منذر نے پوچھا کہ: ''کیا یہ جگہ وحی سے متعین کی گئی ہے؟'' حضورؐ نے فرمایا: ''نہیں۔'' چنانچہ حضورؐ نے اپنی رائے واپس لے لی اور حبابؓ کی رائے کے مطابق جگہ تبدیل فرمائی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر وحی صرف قرآن ہے تو بحوائے بلغ ما انزل الیک (۵:۶۷) ہر ایسی وحی کا پہنچا دینا حضور پر فرض تھا۔

اگر کوئی تنزیلی وحی تعیین فرودگاہ کے متعلق آئی ہوتی تو حضور خود ہی اسے دوسروں تک پہنچا دیتے۔ ''بلغ'' کے یہ معنی تو نہیں کہ کوئی پوچھے تو بتاؤ ورنہ چھپائے رکھو۔ بدر کے تین سو تیرہ سرفروشوں کو ایک وحی کا پہنچا دینا کچھ ایسا دشوار نہ تھا۔ اگر تعیین فرودگاہ کے متعلق کوئی تنزیلی وحی آئی ہوتی تو حضور ازخود ہی اسے دوسروں تک پہنچا دیتے اور جناب حبابؓ کو بھی معلوم ہو جاتا۔ حبابؓ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ حضورؐ تنزیل کو چھپا کر نہیں رکھتے بلکہ ہر ممکن ذریعے سے اسے دوسروں تک پہنچا دیتے ہیں۔ اب یہ سوال ہے کہ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود جناب حبابؓ نے یہ کیوں دریافت کیا کہ یہ جگہ وحی سے متعین کی گئی ہے؟ حبابؓ کے اس سوال سے ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ یعنی حبابؓ یہ تو اچھی طرح جانتے تھے کہ فرودگاہ کی تعیین تنزیل سے تعلق نہیں رکھتی ورنہ حضور ازخود ہی اعلان فرما دیتے۔ لیکن چونکہ بعض وحی ایسی بھی ہوتی ہے جس کا اظہار و ابلاغ ضروری نہیں ہوتا بجز اس کے کہ اس کی ضرورت پیش آئے۔ لہٰذا دریافت کر لینا چاہیے......بس یہی ہے وحی کی وہ قسم جسے ہم الہام کہتے ہیں جو تنزیلی وحی سے الگ چیز ہے۔ اس واقعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ

صحابہ کرامؓ اس نوع وحی (الہام) کی حقیقت سے واقف تھے ورنہ یہ جانتے ہوئے کہ وحی کا ابلاغ از خود حضورؐ کا اولین فریضہ ہے، یہ کیوں دریافت کرتے کہ "کیا یہ جگہ وحی سے مقرر کی گئی ہے؟"

تیسری دلیل

حضورؐ کا بعض غیبی خبریں دینا، جن کا ذکر قرآن میں نہیں، الہام ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر اخبار عن الغیب کا سارا دفتر ہی غلط مان لیا جائے تو خصائص نبوی کے بڑے حصے سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ عقل یہ تو مان سکتی ہے کہ اخبار عن الغیب کے اس پورے دفتر میں بہت سے غلط اجزا کی آمیزش ہوگئی ہو۔ لیکن یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ یہ پورے کا پورا دفتر ہی جعلی اور الحاقی ہے۔ درآں حالیکہ بہت سی خبریں ایسی ہی ہیں جو وقوع سے صدیوں پہلے کتابوں میں شائع ہوئیں، اور بعد میں حرف بہ حرف پوری ہوئیں اور کتنی آئندہ پوری ہوں گی۔ ان پیشین گوئیوں، بشارتوں اور غیبی خبروں کو محض بصیرت نبوی سے منتھی کر کے الگ ہو جانا مشکل ہے۔ ان مثالوں پر غور کیجیے، جن میں حضورؐ فرماتے ہیں...... "میں نے عمرؓ کا محل جنت میں دیکھا" ...... "ابوطالب آتشیں چشمے میں کھڑا ہے" ...... "کل اس جگہ ابوجہل مارا جائے گا" ...... "خبیبؓ شہید کر دیئے گئے" ...... "مصر عمرو بن العاصؓ کے ہاتھوں فتح ہوگا" ...... "میرے بعد اے فاطمہؓ سب سے پہلے تم مجھ سے ملوگی" ...... "سراقہؓ تیرے ہاتھوں میں کسریٰ کا طلائی کنگن دیکھ رہا ہوں" ...... "فلاں جگہ آگ لگے گی جس کی روشنی میں یہاں اونٹ کی گردن دکھائی دے گی" ...... "آگاہ رہو کہ یہ مجاہد (قزمان) جہنمی ہے" ...... "جعفر طیارؓ کے دونوں بازو کٹ گئے" ...... "ابھی جبریلؑ مجھے فلاں بات بتا گئے ہیں" ...... وغیرہ وغیرہ۔ ایسی ایسی بیسیوں مثالیں ہیں۔ ان روایات کو تاریخ محض کا مقام دینے کے

بعد بھی آپ کہاں کھپائیں گے؟ یہ باتیں انسانی بصیرت اور بشری عقل وفراست سے تعلق نہیں رکھتیں۔ ان کو اس قسم کے القا اور واردات بھی نہیں قرار دے سکتے جو کسی فن کے ماہر کو اس فن میں ہوا کرتے ہیں۔ تنزیل میں ان چیزوں کا کوئی اشارہ تک نہیں۔ پھر یہ سب کیا ہیں؟ کیا یہ سب شروع سے آخیر تک جعلی اور الحاقی ہی روایات ہیں؟ عقل اسے تسلیم نہیں کرتی۔ خصوصاً اس لیے کہ ان میں جس کا ظہور اس دنیا میں ہو سکتا تھا وہ اوراق تاریخ پر ابھرے ہوئے حروف میں ثبت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ فقط ایک ''اچھے قسم کے لیڈر ہی نہیں'' تھے کچھ اور بھی تھے جس بشر کا ظرف تنزیل کا بوجھ برداشت کر لے، اس کے لیے الہام تو ایک معمولی چیز ہے۔ ایسی روایات صحیحہ کا تعلق بھی اسی نوع وحی سے ہے جسے ہم الہام کہتے ہیں۔

چوتھی دلیل

ایک چیز اور بھی دیکھتے چلیے۔ قرآن پاک میں ہے کہ حضورؐ نے اپنی بعض ازواج سے رازدارانہ طور پر ایک بات فرمائی مگر وہ راز نہ رکھ سکیں اور دوسری ازواج پر ظاہر کر دیا۔ حضورؐ کو اس کی اطلاع ہو گئی۔ راز ظاہر کرنے والی حرم محترم کو بھی حضور نے آگاہ فرما دیا کہ ''تمہارے افشائے راز کا حال مجھے معلوم ہو گیا'' وہ حیرت سے پوچھتی ہیں کہ ''آپؐ کو یہ اطلاع کس نے دی؟'' حضورؐ جواب دیتے ہیں کہ مجھے خدائے علیم وخبیر نے یہ اطلاع دی ہے۔ اس واقعے کو قرآن ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے:

وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَن بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنبَأَكَ هَٰذَا قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ (٦٦:٣)

قابل ذکر ہے وہ وقت جب کہ پیغمبرؐ نے ایک بات اپنی بعض بیویوں سے

رازدارانہ کہی۔ جب اس نے اس راز کو دوسری پر کھول دیا اور اللہ نے اس افشا کا حال پیغمبرؐ پر ظاہر کر دیا تو اس کا کچھ حصہ واضح کیا اور کچھ حصے سے اعراض برتا، پھر جب پیغمبرؐ نے اس فاش کرنے والی کو بتایا تو اس نے پوچھا کہ آپ کو یہ کس نے بتایا؟ پیغمبرؐ نے کہا کہ مجھے خدائے علیم وخبیر نے بتایا ہے۔

ذرا غور فرمایئے۔ ایک ام المومنین پوچھتی ہیں کہ یہ حضورؐ کو کس نے بتایا کہ میں نے حضورؐ کا راز فاش کر دیا ہے۔ حضورؐ جواب دیتے ہیں کہ خدا نے بتایا۔ اب سوال یہ ہے کہ خدا کی طرف سے بتائے جانے کا کیا طریقہ ہوسکتا ہے؟ یقیناً وحی۔ اب دیکھیے اگر وحی صرف تنزیل (قرآن) ہے تو اس کا ذکر کہیں قرآن میں ہونا چاہیے، مگر یہ کہیں موجود نہیں۔ پھر تو نعوذ باللہ ایسا ہی ہوگا کہ حضورؐ فرمائیں کہ مجھے خدا نے نماز کا حکم دیا ہے اور نماز کا کہیں قرآن میں ذکر ہی نہ ہو۔ اندریں صورت اس مشکل کا حل اس کے سوا اور کچھ نہیں نظر آتا کہ خدا کے بتانے کا ذریعہ تنزیل کے سوا کچھ اور بھی تسلیم کیا جائے۔ بس یہی الہام ہے۔

ایک نکتہ

آیت کے ایک ٹکڑے میں ایک نکتہ اور بھی قابل غور ہوسکتا ہے۔ ''عرف'' کے معنی ہیں جاننا یعنی پوری طرح وضاحت کر دی اور ''اعراض'' کے معنی ہیں پہلوتہی کی یا محض سرسری طور پر اشارہ کر دیا، یہاں اعرض، عرف کے مقابلے میں لایا گیا ہے۔ یہاں ''عرف'' کا فاعل حضورؐ کو بھی مانا جاسکتا ہے۔ یعنی جو کچھ حضورؐ کو اللہ نے بذریعہ الہام بتایا اس کا ایک حصہ حضورؐ نے ام المومنین پر واضح فرما دیا، اور دوسرے حصے سے صرف نظر کیا، جس کے معنی یہ ہوئے کہ الہامی وحی کے تمام حصوں کا ظاہر کرنا ضروری نہیں کیونکہ ابلاغ کلی کا حکم صرف تنزیلی وحی کے لیے ہے۔ (بلغ ما انزل الیک) بہرحال یہ پہلو بھی آیت کے اس ٹکڑے کا نکل سکتا ہے اگرچہ اس میں وہ قطعیت نہیں۔

پانچویں دلیل

قریباً یہی صورت اور جگہ بھی ہے:

وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ (۸:۷)

اور وہ وقت یاد کرو جب کہ اللہ تم سے وعدہ کررہا تھا کہ دو گروہوں میں سے ایک تمہارے ہی لیے ہے اور تمہاری خواہش یہ تھی کہ جو گروہ کم شوکت وقوت والا ہے وہی تمہارے حصے میں آئے۔

یہ غزوہ بدر سے پہلے کے ایک واقعے کی طرف اشارہ ہے جس کی تفصیلات میں جانا اس وقت غیر ضروری ہے۔ سوال صرف اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے جو وعدہ کیا وہ یقیناً بواسطہ رسولؐ ہی کیا ہوگا۔ اب اگر رسولؐ سے اللہ کے وعدے کی شکل صرف تنزیل ہی ہے تو قرآن میں اسے کہیں ہونا چاہیے (کیونکہ یہ قصہ ماضی ہے اور ''اذا'' سارے قرآن میں قصہ ماضی ہی کے لیے آیا ہے) لیکن قرآن میں اس وعدے کا کہیں ذکر نہیں۔ پھر اس کی شکل بجز الہام کے اور کیا ہوسکتی ہے؟

نتیجہ

ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عام طور پر صحابہ کرام حضورؐ کی ان نوع وحی سے بھی واقف تھے اور تنزیل والہام کے فرق (لفظی وغیر لفظی) سے بھی آشنا تھے اور ان دونوں کی حدودِ ابلاغ سے بھی باخبر تھے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ خود بعض صحابہ کو اور الی یومنا ھذا بہت سے بندگان خاص کو الہام ہو اور پیغمبر اس سے محروم ہو؟ یہ تو ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی کہے کہ انسان ناطق تو ہے مگر متحرک بالارادہ نہیں۔ ناطق تو ہوتا ہی ہے حیوان یعنی متحرک بالارادہ۔

اوپر کی تمام بحثوں سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دونوں قسموں کی وحی آتی تھی۔ ان ہی دونوں کو قدیم اصطلاح میں وحی جلی و وحی خفی، یا وحی ملفوظ و وحی غیر ملفوظ یا وحی متلو و وحی غیر متلو کہتے ہیں اور ان ہی دونوں کو ہم تنزیل و الہام سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ یہ دونوں اصطلاحیں زیادہ واضح معلوم ہوتی ہیں۔

دوسرا باب

اس کے بعد ہمارے موضوع کا دوسرا باب شروع ہوتا ہے جس میں یہ دکھانا ہے کہ الہام کا ہمیں کس حد تک پابند بنایا گیا ہے اور تنزیل والہام کے اتباع میں کیا فرق ہے۔

حدیث رسول

یہ مسلم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد ہی ابلاغ تنزیل یعنی تبلیغ قرآن ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا حضورؐ ساری عمر صرف قرآن ہی بولتے رہے، اس کے سوا نہ کچھ کیا، نہ بولے، نہ دیکھا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ دعویٰ کوئی معمولی عقل ودانش رکھنے والا انسان بھی نہ کرسکے گا۔ یقینی بات ہے کہ حضورؐ نے قرآنی الفاظ کے علاوہ بھی کچھ فرمایا ہوگا۔ بس اسی چیز کا نام ''حدیث'' ہے۔ اسی میں حضورؐ کے افعال بھی داخل ہیں۔ اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ۶۳ سال کی عمر میں...... یا نبوت کے ۲۳ سال میں...... حضورؐ نے جو کچھ فرمایا، جو کچھ کیا، وہ حرفاً حرفاً سب محفوظ ہے؟ اگر ایسا نہیں تو کیا اس کی کوئی چیز بھی محفوظ نہیں؟ ہر صاحب عقل کے نزدیک دونوں کا جواب نفی ہی میں ہوگا۔ حقیقت نہ وہ ہے نہ یہ۔ بلکہ یہ ہے کہ حضورؐ کے بے شمار فرامین واعمال محفوظ ہیں۔ رتی رتی بات تو کسی انسان کی بھی محفوظ

نہیں رہ سکتی۔ چند ہفتوں کی بھی ذرا ذرا سی بات کا محفوظ ہونا ناممکن ہے۔ بس زیادہ سے زیادہ یا کم سے کم ہوسکتی ہے۔ حضورؐ کے متعلق یہ بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ باتیں محفوظ رہ گئیں۔ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ حضورؐ کی زندگی کا کوئی بھی واقعہ یا عمل، یا قول محفوظ نہیں رہا تو دنیا کی جس ہستی کے متعلق جو کچھ بھی ہے اسے غلط ماننا پڑے گا۔ گویا قرآن کے سوا جو کچھ بھی کہیں لکھا ہوا ہے وہ غیر محفوظ ہے۔

اب یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ حضورؐ کی زندگی کے بہت سے پہلو خواہ قولی ہوں یا فعلی یا تقریری محفوظ ہیں۔ ایک تیسرا سوال پھر سامنے آتا ہے کہ جو کچھ بھی حضورؐ کے متعلق ہے، جسے ہم ''حدیث'' کہتے ہیں، کیا وہ سب لفظاً لفظاً حرفاً حرفاً صحیح ہے یا سب کا سب مجموعہ اغلاط ہے؟ اس کے جواب کی نوعیت بھی وہی ہے جو دوسرے سوال کے جواب کی ہے یعنی نہ تو سب کا سب کانٹے کی تول سے صحیح ہے اور نہ سب کا سب سراسر غلط۔ بلکہ کچھ حصہ صحیح ہے اور کچھ غلط یا مشتبہ۔

اب چوتھا سوال سامنے آتا ہے کہ جتنی بھی حدیثیں صحیح ہیں وہ کل الہامی ہیں یا سب کی سب غیر الہامی؟

پھر پانچواں سوال یہ ہے کہ جو حصہ الہامی ہے وہ بالکل قرآن کی طرح کی وحی ہے یا اس سے مختلف؟

ہم اس وقت صرف چوتھے اور پانچویں سوال پر روشنی ڈالیں گے۔

یہ درست ہے کہ صحیح احادیث کے ساتھ غلط روایات کی بھی آمیزش ہوگئی ہے لیکن اگر دس کھرے سکوں میں دو چار بلکہ دو چار سو بھی کھوٹے سکے مل جائیں تو تمام کے تمام سکے ساقط الاعتبار نہیں ہو جائیں گے۔ کھرے کھرے ہی رہیں گے اور کھوٹے کھوٹے۔ غلط روایات یا ان کے معیار سے ہمیں اس وقت بحث نہیں بلکہ صرف صحیح کو صحیح مان کر ان کے اصلی مقام کی تلاش مقصود ہے۔

محدث کا نکتہ نظر

محدث کو اگر کوئی قول رسول مل جائے تو وہ دو چیزوں کو دیکھے گا روایت کو اور درایت کو۔

روایت میں وہ دیکھے گا کہ:

۱۔ اس کی سند متصل ہے۔

۲۔ راوی سب ثقہ ہیں۔

درایت میں یہ دیکھے گا کہ اس کا مضمون:

۱۔ عقل کے خلاف تو نہیں؟

۲۔ اصول کے مطابق ہے؟

۳۔ مشاہدے سے تو نہیں ٹکراتا؟

۴۔ قرآن کے مخالف تو نہیں؟

۵۔ متواتر حدیث سے اس کا تناقض تو نہیں؟

۶۔ اجماع قطعی سے بھی متعارض اور قابل تاویل تو نہیں؟

۷۔ عذاب یا ثواب میں مبالغہ تو نہیں؟ وغیرہ وغیرہ......

اس کے بعد اگر محدث کو روایت اور درایت کے متعلق ان دونوں پہلوؤں سے اطمینان ہو گیا تو وہ اس روایت یا حدیث کو اپنی کتاب میں درج کرے گا، اور وہ ایسا کرنے میں نیک نیت اور حق بجانب ہو گا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ وہی روایت کسی دوسرے محدث کی نگاہ میں صحیح نہ ہو، یا فی نفسہ وہ روایت درست نہ ہو۔ بہر حال اسے صحیح سمجھ کر درج کتاب کرنے والا ہرگز قابل ملامت نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے ذوق سے اور قواعد واصول کے لحاظ سے صرف اتنا کرتا ہے کہ روایت و درایت کے لحاظ سے کسی حدیث کا درجہ متعین کر دیتا ہے کہ یہ متواتر

ہے یا مشہور یا آحاد یا اس کی فلاں قسم در قسم سے اس کے درجے کا تعلق ہے۔ محدث کا صرف اتنا ہی کام ہوتا ہے۔ اسے اس سے کوئی بحث نہیں کہ یہ حدیث الہامی ہے یا غیر الہامی، اور عمل کی دنیا میں از رُوئے اتباع یہ کیا درجہ و مقام رکھتی ہے۔

فقیہ کا زاویہ نگاہ

لیکن فقیہ ایک دوسری نگاہ سے بھی حدیثوں کو دیکھتا ہے۔ وہ عمل کی دنیا میں کئی لحاظوں سے مقام حدیث کو متعین کرتا ہے۔ حدیث تو حدیث ہے، قرآن کا فہم بھی بغیر تفقہ کے ناقص ہی رہتا ہے۔ فقہ (تفقہ) سے ہماری مراد کنز وقدوری نہیں بلکہ وہ تو اترامت ہے جس کا ایک معمول مظہر ہیں کنز وقدوری، ہدایہ و شرح وقایہ وغیرہ۔ جن درجات حدیث کا ہم ذکر کرنا چاہتے ہیں ان کی تعیین دراصل ایک فقیہ کا کام ہے، نہ کہ جامع روایت کا۔ ایک فقیہ جب مختلف روایات پر نظر ڈالتا ہے تو اسے صاف نظر آتا ہے کہ حضورؐ کی تمام باتیں ایک ہی درجہ نہیں رکھتیں بلکہ

بعض باتیں حضور نے طبعی تقاضے سے فرمائیں مثلاً کھانا لاؤ۔

بعض امیر کی حیثیت سے فرمائیں مثلاً تم (اے تیر اندازو) اس درے کو نہ چھوڑنا۔

بعض شوہر، بھائی، باپ یا آقا کی حیثیت سے، مثلاً میرے سر پر پانی ڈالو۔

بعض سفارش کے طور پر مثلاً تم (اے بریرہ) مغیث سے نکاح کرلو۔

بعض بطور نصیحت مثلاً آداب کے متعلق خاص خاص نصائح۔

بعض مصلحت وقتی کی بنا پر مثلاً تم (اے بنی عبد قیس) شراب کے فلاں فلاں برتنوں کا استعمال ترک کردو۔

بعض بشری غیظ و غضب میں مثلاً فلاں پر لعنت ہو۔

بعض فنی عدم مہارت کی وجہ سے مثلاً خرمے کے جوڑے نہ ملاؤ۔

بعض طبیعت و مزاح کے طور پر مثلاً تم نے (اے علی) بہت ساری کھجوریں کھالیں۔

بعض حکایۃً مثلاً میں اس تالاب میں تیرا کرتا تھا۔

بعض تشریحاً وتفسیراً مثلاً اس لفظ یا اس اصطلاح کے یہ معنی ہیں۔

بعض اشارۃً وکنایۃً مثلاً تطہری (ایام سے پاکیزگی حاصل کرلے)

بعض تائیداً مثلاً سچ ہے (اے بنی حارث بن کعب) تمہارے شکست نہ کھانے کی یہی وجہ ہے جو تم نے بیان کی۔

بعض تعلیماً واصلاحاً مثلاً (اے عبداللہ بن زبیر) تم اپنے سامنے سے کھاؤ۔

بعض تمثیلاً مثلاً روح کے لیے پنجگانہ نماز ایسی ہی ہے جیسے جسم کے لیے پنجگانہ غسل۔

بعض استعجاباً یا طنزاً مثلاً تم بڑے چوڑے تکیے والے یعنی سادہ لوح ہو۔

بعض سوالاً مثلاً تم کس قبیلے سے ہو؟

بعض ظناً وتخمیناً مثلاً میں اپنے اس خواب سے یہ سمجھا تھا کہ ہجرت شام کی طرف ہو گی۔

بعض اظہار اندیشہ کے طور پر مثلاً میرا خیال ہے کہ اس وفد خبیبؓ کے ساتھ دغا کی جائے گی۔

بعض امتحان کے لیے مثلاً (اے انصار) تم اگر کہو تو نصف پیداوارِ مدینہ پر اہل خندق سے صلح کرلی جائے۔

بعض بطور انتباہ مثلاً (اے یہودِ بنی قینقاع) کہیں تمہارا بھی وہی حشر نہ ہو جو اہل بدر کا ہوا۔

بعض جواباً عن السوال مثلاً ہاں میں نقیر کی حقیقت سے واقف ہوں۔

بعض راز داری کے طور پر مثلاً

واذ اسر النبی الی بعض ازواجہ حدیثاً۔

بعض معالج کی حیثیت سے مثلاً بخار والے کو نہلا دو۔

بعض دعا مثلاً ادعیہ ماثورہ

بعض جج کی حیثیت سے مثلاً عدالتی مقدمات کے فیصلے۔

بعض اخبار اً عن الغیب مثلاً میری اس ضرب سے کسریٰ و قیصر کے خزانوں کے دہانے کھل گئے اور بعض ابلاغِ تنزیل کے حکم کی تعمیل کے لیے مثلاً سارا قرآن۔

غرض کہاں تک اقسام شمار کی جائیں مختصراً یوں سمجھیے کہ ایک انسان کی زندگی میں جتنے مراحل آتے ہیں، حضورؐ کی مبارک زندگی میں وہ سب پیش آتے رہے اور ان کے تقاضوں کے مطابق حضورؐ کی زبان اقدس سے کلمات نکلتے رہے، افعال مبارک کو بھی اس پر قیاس کر لیجیے۔ بس ان ہی چیزوں کو احادیث کہتے ہیں اور ان کے وجود سے نہ عقلاً انکار کیا جا سکتا ہے نہ تاریخاً۔

تمام احادیث وحی نہیں

لیکن یہ تسلیم کیے بغیر بھی چارہ کار نہیں کہ احادیث کی جو چند فطری قسمیں ابھی بیان کی گئی ہیں وہ سب کی سب...... احادیث ہونے کے باوجود...... از روئے اتباع ایک ہی درجہ و مقام نہیں رکھتیں یعنی یہ ممکن نہیں کہ یہ ساری باتیں حضورؐ وحی سے فرمایا کرتے ہوں۔ کون باور کر سکتا ہے کہ حضورؐ کھانا بھی وحی سے کھاتے تھے، پانی بھی وحی سے پیتے تھے، ازواج کے پاس بھی وحی سے جاتے تھے، غصہ بھی وحی سے فرماتے تھے، مشورے بھی وحی سے لیتے یا دیتے تھے، کوئی سوال بھی وحی سے فرماتے اور سوال کا جواب بھی وحی سے دیتے تھے۔ مزاح

بھی وحی سے فرماتے تھے۔ امتحان بھی وحی سے لیتے تھے، سونے، جاگنے اور خواب دیکھنے کا کام بھی وحی سے کرتے تھے، حاجات ضروریہ کے لیے بھی وحی سے باہر جاتے تھے، تمثیلات بھی وحی سے پیش فرماتے تھے۔ غرض ساری باتیں اور تمام کام وحی سے ہی کرتے تھے اور زندگی کی ہر حرکت اور سکون نتیجۂ وحی ہوتا تھا؟

مطابق وحی اور عین وحی کا فرق

یہ سو فیصد صحیح ہے کہ حضورؐ کی تمام باتیں وحی کی پیروی تھیں اور مطابق وحی تھیں، حدود وحی کے اندر تھیں لیکن ساری باتوں کو عین وحی قرار دینا درست نہیں جیسا کہ ابھی اوپر بیان کیا گیا۔ کسی چیز کا عین وحی ہونا اور چیز ہے اور پیروی یا مطابق وحی ہونا شے دیگر ہے۔ حضورؐ کی تمام باتوں کے متعلق تو عین الہام ہونے کا بھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، چہ جائیکہ عین تنزیل ہونے کا دعویٰ کیا جا سکے۔ تنزیل صرف قرآن ہے۔ حدیث کا ایک لفظ بھی تنزیل نہیں چہ جائیکہ ساری احادیث تنزیل کا درجہ رکھتی ہوں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حدیثیں ......وہ بھی بہت ہی مختصر سا حصہ احادیث...... الہام ہیں۔

احادیث ما انزل اللہ نہیں

جب صورت حال یہ ہو تو احادیث کو ما انزل اللہ یا اس کے مثل نہیں کہنا چاہیے۔ ما انزل اللہ صرف قرآن یا (دوسری ملفوظ کتب سماویہ) ہیں، روایات نہیں۔ ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجوہ ہماری سمجھ میں یہ آتی ہیں۔

۱۔ اگر حضورؐ کی ساری باتیں وحی ہوں تو حضورؐ کی زندگی کا نوع بشری کے لیے نمونۂ عمل بننا تکلیف مالا یطاق ہو جاتا ہے کیونکہ جس کے پاس ہر ہر حرکت و سکون کے لیے وحی کی قدغن موجود ہو اس کی حیثیت ایک ''الٰہی مشینری'' کی سی ہو جاتی ہے اور خود اس صاحب وحی

کا کمال نہیں باقی رہتا۔ اگر اسے کمال تسلیم کر لیا جائے تو دوسروں کے لیے قابل تقلید نمونہ نہیں باقی رہتا۔ اس لیے کہ اور کسی کے پاس وحی کی کوئی ایسی برقی رو نہیں جو اس کی پوری زندگی کو ایک مشین کی طرح چلاتی رہے۔

۲۔ نیز اس صورت میں یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ جس طرح قرآن کریم سینوں اور سفینوں میں محفوظ کر کے امت کو دے دیا گیا، اسی طرح دفاتر حدیث کو بھی قرآن کے ساتھ ساتھ اسی طرح سینوں اور سفینوں میں محفوظ کر کے دے دیا جاتا۔

۳۔ حضرت عمرؓ حدیث بیان کرنے والے پر دو گواہوں (ورنہ درے) کی قدغن نہ بٹھاتے۔ یا پھر یہ ہوتا کہ قرآن کی آیتوں پر بھی یہی قدغن لگا دیتے۔

۴۔ صف اول کے صحابہ خصوصاً عشرہ مبشرہ بالخصوص خلفائے راشدین بھی اسی طرح مکثر فی الروایہ ہوتے جس طرح ابو ہریرہؓ، عائشہ صدیقہؓ، ابن عمرؓ، ابن عمروؓ اور ابن عباسؓ وغیرہم تھے۔

۵۔ تمام احادیث بھی نمازوں میں اور نمازوں سے باہر بھی قرآن کی طرح تلاوت کی جاتیں تاکہ ان کے احکام بھی ہر وقت قرآن کی طرح پیش نظر اور محفوظ رہیں۔

۶۔ قرآن کے نسخوں کی طرح کتب احادیث کے نسخے بھی ہر جگہ بھیج دیے جاتے۔

۷۔ سیدنا عمرؓ نے جس وقت ''حسبنا کتاب اللہ'' کہا تھا، اسی وقت حضورؐ اصلاحاً فرما دیتے کہ...... ''واحادیث رسولہ''۔

۸۔ صحابہ بعض احکام رسالت کو اپنے دور میں بدلنے سے اسی طرح باز رہتے جس طرح قرآنی احکام کو تبدیل کرنے سے محترز رہے۔ (اس کی مثالیں آگے آئیں گی)

۹۔ جس طرح قرآن نے دیگر کتب سماویہ پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے اسی طرح کتب احادیث پر بھی ایمان لانے کا بار بار ذکر کرتا اور ایمان مفصل یوں ہوتا......

امنت باللہ وملئکتہ وکتبہ ورسلہ وکتب احادیث رسلہ والیوم الآخر۔

۱۰۔ جس طرح کسی آیت قرآنی کا منکر کافر ہو جاتا ہے اسی طرح ہر حدیث کا منکر بھی کافر ہوتا ہے۔ حالانکہ کوئی محدث بھی ایسا نہیں جس نے کسی نہ کسی حدیث کا انکار نہ کیا ہو۔

۱۱۔ جس طرح قرآن لاکھوں آیتوں میں سے چھانٹ کر تیار نہیں کیا گیا، اسی طرح کوئی حدیث کی کتاب بھی لاکھوں احادیث میں سے چھانٹ کر نہ لکھی جاتی۔

۱۲۔ جس طرح قرآن کی ہر آیت یکساں متواتر ہے، اسی طرح ہر حدیث بھی متواتر ہوتی اور اس کا تواتر بھی قرآنی تواتر کے درجے پر ہوتا۔

۱۳۔ جس طرح قرآن کی کوئی آیت متواتر، کوئی مشہور، کوئی آحاد...... پھر کوئی مرفوع، کوئی متصل، کوئی منقطع، کوئی مرسل، کوئی مدلس، کوئی معلل، کوئی ضعیف، کوئی منکر اور کوئی موضوع وغیرہ نہیں (نعوذ باللہ من ذٰلک) بلکہ ہر آیت یکساں درجے کی متواتر ہے اسی طرح حدیثوں میں بھی ہوتا اور احادیث کی مندرجہ بالا اقسام نہ ہوتیں۔

۱۴۔ جس طرح کسی آیت کا صرف بین الدفتین ہونا آیت ہونے کا واحد ثبوت ہے، اسی طرح کسی حدیث کا کتب احادیث میں موجود ہونا ہی اس کے صحیح ہونے کا کافی اور واحد ثبوت ہوتا، حالانکہ کوئی کتاب حدیث ایسی نہیں جس میں کوئی ناقابل اعتبار روایت موجود نہ ہو۔

۱۵۔ ہر آیت قرآنی جس طرح آیت قرآنی ہونے کے لیے دوسرے تمام علوم وفنون سے بے نیاز اور بالاتر ہے، اسی طرح کسی روایت کی پرکھ کے لیے بھی نہ کتب رجال کی ضرورت ہوتی، نہ طبقات کی، نہ تذکرہ الحفاظ کی، نہ قوانین جرح وتعدیل کی، نہ فن توفیق کی، نہ علم تلفیق کی، نہ کتب الضعفا کی، نہ کتب موضوعات کی اور نہ کتب مدلسین وغیرہ کی۔

۱۶۔ جس طرح ہر آیت کو ہر فرقہ آیت قرآنی تسلیم کرتا ہے، اسی طرح ہر حدیث کو ہر فرقہ تسلیم کرتا اور ہر فرقے کی احادیث الگ الگ نہ ہوتیں۔

۱۷۔ جس طرح قرآن کے متعلق اِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵:۹) اور اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (۷۵:۱۷) ہے اسی طرح احادیث کے متعلق بھی کچھ ہوتا۔

۱۸۔ جس طرح کوئی قرآنی آیت کسی سند کے ساتھ نہیں لکھی جاتی، اسی طرح ہر حدیث بھی کتب حدیث میں اسناد کے بغیر ہی لکھی جاتی اور قرآن کی طرح حدیثیں بھی اسناد و رواۃ کی احتیاج سے بالاتر ہوتیں۔

۱۹۔ قرآن کی طرح حدیثیں بھی اختلاف و تناقض سے پاک ہوتیں اور حدیثوں کے من عند اللہ ہونے کی بھی وہی دلیل ہوتی، جو قرآن کے من عند اللہ ہونے کی خود قرآن نے یوں دی ہے کہ

لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۴:۸۲)

اگر یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں بڑے اختلاف پاتے۔ اور

۲۰۔ جس طرح قرآن پڑھنے سے پہلے پورے یقین کے ساتھ قال اللہ تعالیٰ کہا جاتا ہے، اسی طرح حدیث بیان کرنے سے پیشتر اسی یقین کے ساتھ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا جایا کرتا اور آخر میں ''او کما قال'' ہرگز نہ کہا جاتا۔ قرآن کی کوئی سورت یا آیت پڑھ کر ''او کما قال تعالیٰ'' نہیں کہا جاتا۔ ''او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم'' کہنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس روایت کا منسوب الی الرسول ہونا یقین کے اس مرتبے پر نہیں جس پر قرآن کا منسوب الی اللہ ہونا ہے۔ حدیث کا منسوب الی الرسول ہونا صرف ظن غالب کے حکم میں ہوتا ہے وہ بھی جب کہ صحیح اور مطابق قرآن ہو۔

۲۱۔ قرآن کی طرح حدیث کی روایت بالمعنیٰ بھی ناجائز ہوتی، حالانکہ احادیث نوے

فیصد سے زیادہ روایت بالمعنی ہیں اور اسی وجہ سے ہر حدیث بیان کرنے کے بعد بہ تقاضائے احتیاط کہا جاتا ہے ''او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم''

کہاں تک لکھا جائے؟ اتنے ہی شواہد سے یہ بات بآسانی سمجھی جا سکتی ہے کہ حدیثیں نہ تو ما انزل اللہ ہیں، نہ اس معنی میں ''مثلہ معہ'' ہیں۔

مثلہ معہ

مثلہ معہ کا ذکر آ گیا ہے تو کچھ اس کے متعلق بھی سن لینا چاہیے۔[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بیان کی جاتی ہے کہ...... ''مجھے صرف قرآن ہی نہیں دیا گیا بلکہ اسی طرح اور اسی کے ساتھ (مثلہ معہ) ایک اور چیز بھی دی گئی ہے''......اس حدیث سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ وہ ''مثلہ معہ'' احادیث ہیں اور مثل القرآن مع القرآن ہونے کی وجہ سے قرآن کے ہم پلہ ہیں۔ بلکہ بعض محدثین نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ حدیثیں قرآنی احکام میں حک و اضافہ بھی کر سکتی ہیں اور اسے منسوخ بھی کر سکتی ہیں۔

ہم اس ''مثلہ معہ'' والی روایت کی سند وغیرہ پر کوئی بحث نہیں کریں گے۔ یہ ممکن ہے کہ یہ روایت ہی بالکل غلط ہو۔ لیکن اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو ''مثلہ معہ'' کا یہ مطلب سمجھنا صحیح نہیں کہ حدیثیں قرآن کی ہم پلہ ہیں۔ ''مثل'' کا لفظ جہاں بھی آئے اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ تمام جہات ستہ سے اس میں مثلیت موجود ہو۔ مثلیت کے لیے ایک دو

---

[1] علامہ تمنا عمادی پھلواروی کا ایک پر مغز مضمون دسمبر ۵۳ء کے ''طلوع اسلام'' میں شائع ہوا تھا۔ علامہ ممدوح اس دور میں فن رجال کے امام ہیں۔ انہوں نے اس حدیث پر اپنے خاص زاویہ نظر سے سخت جرح کی ہے اور وہ اس روایت ہی کو صحیح نہیں سمجھتے۔ ہم نے یہاں اس مفروضے پر بحث کی ہے کہ یہ روایت صحیح ہو تو اس کا کیا مطلب ہے؟

حیثیتوں کا ہونا کافی ہوتا ہے۔ اگر ہم کسی آدمی کو شیر سے تمثیل دیں تو صرف بہادری وجہ تمثیل ہوتی ہے اور اتنی مثلیت کافی ہے۔ شیر کے مثل ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ آدمی چار پاؤں پر بھی چلتا ہے، جانور کا شکار کر کے کچا گوشت بھی کھاتا ہے اور دُم بھی رکھتا ہے۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے:

وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِى الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُم

(۶:۳۸)

یعنی زمین کے تمام جاندار اور اڑنے والے پرندے سب تمہارے ہی "مثل" امتیں ہیں۔

ظاہر ہے کہ ہر جاندار یا پرندہ صورت و سیرت میں، حقوق و فرائض میں، جوابدہی و انجام میں یقیناً مانند انسان نہیں۔ صرف امت یعنی متحرک بالارادہ مخلوقات کی ٹولیاں ہونے میں انسان کے مثل ہے۔ پس الہامی وحی کو اگر حضورؐ نے "مثل القرآن اور مع القرآن" فرما بھی دیا ہو تو اس مثلیت سے صرف "القائی مثلیت" مراد ہو سکتی ہے نہ کہ مثلیت من جمیع الوجوہ۔ القائی مثلیت سے مقصود یہ ہے کہ جس خدا کی طرف سے تنزیلی وحی ہے اسی خدا کی طرف سے الہامی وحی بھی ہے۔ بس اس سے زیادہ کسی اور مثلیت کو تلاش کر کے الہام کو تنزیل کا ہم پلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

اوپر کی نمبروار بحث سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ تنزیل اور الہام کبھی یکساں نہیں ہو سکتے اس لیے مثل بمعنی ہم پلہ ماننا صحیح نہیں۔

کیا کہیں گے آپ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ "پرندوں میں بھی پیغمبر آتے رہے ہیں اور دلیل یہ دے کہ جہاں پرندوں کو "امم امثالکم" (۶:۳۸) کہا گیا ہے وہیں چار آیتوں کے بعد یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ (۶:۴۲)

یعنی ہم نے تم سے پہلے بھی امتوں میں رسالت بھیجی ہے۔

پرندے ہماری جیسی امتیں (امم امثالکم) ہیں اور امتوں میں پیغمبر آیا کیے ہیں۔ لہٰذا ثابت ہو گیا کہ پرندوں میں بھی پیغمبر آتے رہے ہیں۔" اگر یہ دعویٰ درست نہیں ہو سکتا اور یہاں مثلیت من جمیع الوجوہ نہیں ہو سکتی تو یہ عقیدہ رکھنا کب درست ہو سکتا ہے کہ احادیث ......وہ بھی صرف الہامی حصہ نہیں بلکہ ساری کی ساری...... ہر حیثیت سے ما انزل اللہ کے ہم پلہ، ہم وزن اور برابر اور یکساں ہیں؟ اور صرف اتنا ہی نہیں کہ قرآن و حدیث میں کوئی فرق نہیں بلکہ یہ بھی کہ حدیث قرآن پر قاضی و حکم ہے اور مزید برآں یہ کہ حدیث آیت قرآنی کو منسوخ بھی کر سکتی ہے۔

صحابہ کرامؓ نے حضورؐ کے تمام اقوال کو الہام بھی نہیں سمجھا چہ جائیکہ ما انزل اللہ یا اس کے برابر تصور کرتے۔ حضورؐ کے اقوال کو براہ راست سن کر اور آپ کے افعال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی صحابہؓ نے الہام تک کا درجہ نہیں دیا چہ جائیکہ تنزیل کا مقام دیتے۔ مگر ہم صدیوں بعد کی کتابوں میں روایت در روایت میں کچھ لکھا ہوا دیکھ کر حکم لگا دیتے ہیں کہ یہ سب کا سب من جمیع الوجوہ وحی ہے۔ وحی بھی الہامی نہیں بلکہ تنزیلی اور اتنے ہی پر بس نہیں بلکہ اس سے کچھ زائد...... قاضی و حکم اور ناسخ بھی۔

حدیثیں...... الہامی و غیر الہامی...... سب کی سب اگر عین مطابق تنزیل ہوتیں جب بھی وہ "ما انزل اللہ" اور اس معنی میں "مثلہ معہ" نہیں ہو سکتی تھیں، چہ جائیکہ وہ حدیثیں جو قرآن یا اس کی روح سے ٹکراتی ہوں۔ ایک موٹی عقل والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ حضور قرآن کی تبلیغ اور اطاعت کے لیے آئے تھے نہ کہ مخالفت کرنے...... العیاذ باللہ۔

جو احادیث مطابق قرآن ہیں...... اور وہ بے شمار ہیں...... ان کے متعلق صرف اتنا کہنا

عین حق ہے کہ یہ تنزیل کے مطابق ہیں نہ یہ کہ عین تنزیل ہیں یا من کل الوجوہ مثل القرآن مع القرآن ہیں۔ عین تنزیل ہونے کا مطلب تو یہ ہے کہ جو درجہ تنزیل کا ہے وہی احادیث کا بھی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔ بخلاف اس کے مطابق تنزیل ہونے کا یہ مطلب ہے کہ تنزیل نے جو حدود کھینچ دی ہیں یہ احادیث ان کے اندر ہی ہیں باہر نہیں...... یہی تو وہ حقیقی نبوی کمال ہے جسے ہم شاید بہت معمولی چیز سمجھ رہے ہیں۔ حدود اللہ کے اندر رہ کر حضورؐ نے جو فیصلے اور احکام دیے ہیں وہ اگرچہ ما انزل اللہ نہیں لیکن بصیرت پیغمبری کا اتنا اعلیٰ وارفع نمونہ ہیں کہ نورِ نبوت کا قائل ہونے کے لیے تنہا یہی چیز کافی ہے۔

حدیثوں کا الہامی حصہ

اوپر کی تمام بحثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ احادیث سب کی سب غلط نہیں ہیں، ان میں صحیح حصے بھی موجود ہیں، اور جو صحیح ہیں ان میں سب الہامی نہیں بلکہ کچھ حصہ الہام کا ہے اور کچھ غیر الہامی ہے۔ جو الہامی حصہ ہے وہ الہام ہونے کے باوجود ما انزل اللہ یا اس کے ہم پلہ نہیں۔ اب ہم اگر احادیث میں الہامی حصے کو تلاش کرنا چاہیں تو یہ کوئی آسان کام نہ ہوگا۔ ہاں چند اصولی باتیں ایسی مل سکتی ہیں جن کی روشنی میں الہامی حصے کو غیر الہامی حصے سے ممتاز کیا جاسکتا ہے۔ اوپر ہم تشریح کر چکے ہیں کہ جہاں اخبار عن الغیب وغیرہ ہے یا جہاں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ سے اس کا الہامی ہونا معلوم ہو...... مثلاً اللہ یوں فرماتا ہے کہ...... یا جبریل بتا گئے ہیں کہ...... یا ازیں قبیل کوئی اور قرینۂ قویہ موجود ہو...... تو ان حدیثوں کو الہامی مانا جاسکتا ہے۔

ان کے علاوہ اور تمام احادیث کو ہم چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں جسے دین کے اجزائے چہارگانہ کہتے ہیں۔ دین کے چار حصے اہل علم یہ بتاتے ہیں:

۱۔عقائد ۲۔عبادات ۳۔اخلاق اور۴۔معاملات

(عبادات سے یہاں مراد ہے مناسک یعنی اظہار بندگی کے اور پرستش کے خاص طریقے) یہ چاروں ایک دوسرے سے ایسے پیوستہ اور جڑے ہوئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود یہ چاروں اجزا اپنی اپنی انفرادی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ اب ہمیں الگ الگ ان چاروں کی تلاش کرنا چاہیے کہ کس جز سے تعلق رکھنے والی روایتوں میں کتنا حصہ الہام کا ہے۔

سردست ہم تین اول الذکر حصے یعنی عقائد و مناسک و اخلاق کو چھوڑتے ہیں۔ کچھ ضمنی طور پر اس کے متعلق ہم آگے لکھیں گے۔ اس وقت ہمیں صرف معاملات سے بحث کرنی ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ اس میں الہام کا کتنا حصہ ہے۔

معاملات اور حدود

جہاں تک معاملات کا تعلق ہے تنزیل نے ان کی صرف حدود بیان کر دی ہیں۔ باقی رہیں جزئی تفصیلات تو ان کو انسانوں کی عقل و بصیرت ہی پر چھوڑا گیا ہے۔ بعض شواہد تو یہ ایسے موجود ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان تفصیلات و جزئیات کا تعلق الہام سے بالکل نہیں۔ ''تنزیل والہام کے فرق'' کے عنوان کے تحت جتنی قسمیں الہام کی ہم لکھ آئے ہیں ان میں غالباً ایک قسم بھی الہام کی ایسی نہیں جو معاملات سے تعلق رکھتی ہو۔ معاملات میں معاشرت، معیشت، معاش، سیاست وغیرہ ساری چیزیں اپنے تمام اجزا و تفاصیل سمیت داخل ہیں اور ان میں سے ہر چیز متبدل ہے۔ اس لیے قرآن پاک نے معاملات کے لیے صرف ''حدود'' ہی بتائی ہیں۔ جزئیات کے لیے نہ تنزیل کی ضرورت تھی نہ الہام کی۔ اگر تمام واقع ہو سکنے والے جزئیات کا احاطہ کیا جاتا تو آپ خود ہی سوچیے کہ کیا یہ ممکن تھا کہ اگر

بعض جزئیات کو متعین کر دیا جاتا جب بھی مصیبت ہو جاتی اور ضرورت کے وقت ان میں کوئی ردو بدل نہ ہو سکتی اور دین کا یہ چوتھا جز متحرک ہونے کی بجائے جامد محض ہو کر رہ جاتا اور معاملات کی فطری حرکت اور متبدل رفتار کا کبھی ساتھ نہ دے سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ معاملات کے معاملے میں تنزیل نے صرف حدود کھینچ دی ہیں اور جزئیات کو عقل و بصیرت پر چھوڑ دیا ہے۔ اگر معدودے چند جزئیات کو متعین بھی کیا ہے تو وہ بھی درحقیقت کسی اصول کی تعلیم کے لیے ہے، جو بجائے خود ایک حد ہے۔

قرآن میں حدود

آپ سارے قرآن میں دیکھ جایئے ''حدود'' کا لفظ جہاں بھی آیا ہے معاملات ہی کے لیے آیا ہے۔ کسی جگہ بھی عقائد، ایمانیات یا مناسک (عبادات) یا اخلاقیات کے لیے حدود کا لفظ نہیں آیا ہے۔ معاملات میں بھی صرف چند مقامات ہیں، جہاں حدود کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ خلع کے بیان میں اور وراثت کے بیان میں، ظہار کے بیان میں، طلاق کے بیان میں اور تعلقات زن و شوہر (بحالت صوم و اعتکاف) کے بیان میں۔ بس یہی پانچ مقامات حدود سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ جہاں بھی معاملات سے تعلق رکھنے والی کوئی بات بیان کی گئی ہے وہاں ''حدود'' کا لفظ ضرور لایا گیا ہے بلکہ کہہ یہ رہے ہیں کہ حدود کا لفظ جہاں بھی آیا ہے معاملات ہی کے سلسلے میں آیا ہے۔ اگر ایک جگہ بھی کہیں عقائد و مناسک یا اخلاق کے سلسلے میں یہ لفظ آیا ہوتا تو یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ معاملات کے علاوہ دوسرے اجزئے دین میں بھی حدود کی ضرورت تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ حدود کی ضرورت وہاں پڑتی ہے جہاں انسان کو عقل و بصیرت سے کام لینا پڑے نہ کہ تنزیل یا الہام سے۔

شرعی سزاؤں کے لیے حدود کا لفظ کوئی قرآنی اصطلاح نہیں لیکن ان کو فقہی اصطلاح

کے مطابق ''حد شرعی'' کہنا غلط بھی نہیں کیونکہ ان کا تعلق بھی معاملات ہی سے ہے۔

معاملات کے سوا کہیں حدود کی ضرورت نہیں

مگر دیکھیے عقائد و عبادات و اخلاق کے لیے یہ لفظ نہ قرآن نے استعمال کیا نہ آپ استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ اصولاً یہ غیر متبدل حقائق ہیں۔ خدا ایک ہے، سبوح و قدوس ہے، ملائکہ فلاں فلاں کام کرتے ہیں، سب نبیوں پر وحی ہوتی رہی، قیامت آنے والی ہے وغیرہ وغیرہ۔ آپ کو ان چیزوں میں ردوبدل کی کیا ضرورت پیش آسکتی ہے جو ان کے لیے حدود کی ضرورت ہو؟ اسی طرح نماز، زکوٰۃ، صوم اور حج وغیرہ میں اصولاً آپ کو کس ترمیم کی ضرورت پڑسکتی ہے جو ان کے لیے حدود درکار ہوں؟ یوں ہی دیکھیے جھوٹ بولنا برا ہے، خدمت خلق اور ہمدردی اچھی صفات ہیں، آپ کو ان میں اصولی لحاظ سے ردوبدل کی کیا ضرورت محسوس ہوسکتی ہے جو ان کے لیے تنزیلی یا الہامی حدود کا بھی ذکر کیا جائے؟

غرض حدود کا لفظ ہی بتاتا ہے کہ اس دائرے میں رہ کر جزئی قوانین مرتب کرنے کا کام عقل و بصیرت پر چھوڑا گیا ہے۔ اور اس کے لیے الہام کی کوئی ضرورت نہیں۔ عقل و بصیرت پر اس اعتماد کا دائرہ صرف دنیائے معاملات پر محیط ہے۔ اس لیے کہ ردوبدل کی ضرورت اسی دنیائے معاملات میں پڑتی رہتی ہے۔ عقائد و مناسک و اخلاق میں ردوبدل کی کیا خاص ضرورت پڑسکتی ہے؟

معاملات کی احادیث

اب آپ ان تمام احادیث پر نظر ڈالیے جو معاملات سے تعلق رکھتی ہیں تو اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ وہ سب کی سب بصیرت نبویؐ کے اعلیٰ ترین نمونے ہیں۔ وہ سب حدود اللہ کے اندر ہیں لیکن ان کا تعلق الہام سے نہیں بلکہ بصیرت سے ہے۔ یہ ہوسکتا ہے

کہ بعض احادیث میں نفس حدود اللہ کو دوسرے لفظوں میں دہرایا گیا ہو اور اس وجہ سے وہ بھی حدود اللہ کی طرح غیر متبدل ہو لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ حضور کے جو فرامین یا فیصلے یا طرز عمل حدود اللہ کے اندر ہوں وہ بھی حدود اللہ ہی کی طرح غیر متبدل اور ابدیت کے حامل ہوں، جو قطعہ زمین کسی چہار دیواری کے اندر ہو اس کا چپہ چپہ چہار دیواری کے اندر تو ہوگا لیکن اس کے اندر بنی ہوئی عمارتیں عین چہار دیواری نہیں ہوں گی۔ عمارتیں حسب ضرورت بدلی جاسکتی ہیں، نئی بھی بنائی جاسکتی ہیں، اور ان میں شکست و ریخت بھی ہوسکتی ہے۔ یعنی چہار دیواری کی حد سے بڑھنے کی تو اجازت نہیں، لیکن اندر رہ کر بوقت ضرورت ردو بدل ہوسکتی ہے اور اس کا اختیار بھی ہونا چاہیے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان عقل و بصیرت کو کام میں لانے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اس مقام پر بھی حضورؐ کو الہام کا پابند کر دیا گیا ہو اور بصیرت نبوی پر اعتماد نہ کیا گیا ہو۔ لہٰذا معاملات کی دنیا سے متعلق جتنی بھی حدیثیں ہیں ان کو بصیرت نبوی ہی کا مظہر سمجھنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات صرف حامل وحی ہی نہ تھی بلکہ آپؐ میں تفقہ، اجتہاد، حکمت اور بصیرت بھی کمال درجے کی موجود تھی۔

بصیرت رسول

پیغمبر کی بصیرت و اجتہاد کوئی ایسی معمولی چیز نہیں ہوتی جسے ہم سرسری نظر سے دیکھ لیا کریں اور اسے معمولی درجہ دے کر ٹال جائیں۔ تمام عالم کے عقلا مل کر بھی وہ بصیرت نہیں پیدا کر سکتے جو تنہا پیغمبر کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کے باوجود وحی، وحی ہے اور بصیرت، بصیرت...... اس بصیرت میں کبھی لغزش بھی ہو جاتی ہے جس کی اصلاح تنزیل یا الہام سے کر دی جاتی ہے۔ اگر معاملات کی دنیا میں حضورؐ کی تمام باتوں کو ہم بصیرت کی بجائے

الہامی مانیں تو بعض بڑی دقتوں کا سامنا ہوگا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضورؐ کی بعض باتوں کی اصلاح بذریعہ وحی کی گئی ہے۔ صرف اسی قدر نہیں بلکہ دوسرے انسانوں کی بصیرت کو بھی حضورؐ اپنی بصیرت پر ترجیح دیتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

مثال اول

ایک عورت کو اس کا شوہر ماں سے تشبیہ دیتا ہے۔ حضورؐ رواجِ عرب کے مطابق اسے طلاق قرار دیتے ہیں۔ وہ عورت حضورؐ سے جھگڑتی ہے اور تنزیل کا فیصلہ اس عورت کے حق میں ہوتا ہے اور حضورؐ اپنا فیصلہ واپس لے لیتے ہیں۔ اٹھائیسواں پارہ اسی بیان سے شروع ہوا ہے۔

مثال دوم

حضورؐ میدانِ بدر میں اہل اسلام کے کیمپ کے لیے جگہ تجویز فرماتے ہیں۔ اور حبابؓ بن منذر کی رائے کو اپنی رائے پر ترجیح دیتے ہوئے جگہ بدل لیتے ہیں۔

مثال سوم

حضور تابیرِ نخل (کھجوروں کا جوڑ املانے) سے روکتے ہیں لیکن تجربے کے بعد "انتم اعلم بامور دنیاکم" (تم اپنے دنیوی معاملات کو مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہو) فرما کر اپنی رائے واپس لے لیتے ہیں۔

نتیجہ

ان مثالوں سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ معاملات میں حضورؐ کے فرامین الہام سے تعلق نہ رکھتے تھے، ورنہ کیوں کر ممکن تھا کہ ایک وحی کوئی حکم دے اور دوسری وحی اسی وقت

اس کے خلاف نازل ہو؟ نیز یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ حضورؐ ایک بات وحی سے فرمائیں اور دوسرے انسانوں کی رائے سے اسے بدل دیں؟ بات صرف اتنی ہے کہ معاملات سے متعلق جتنے فرامین نبویؐ ہیں وہ (چند بشری لغزشوں کو چھوڑ کر) سب کے سب بصیرت نبوی کے اعلیٰ نمونے ہیں اور کسب نور کے لیے وہ بہترین ذخیرے ہیں۔ یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن وہ وحی نہیں، الہامی وحی بھی نہیں چہ جائیکہ تنزیلی وحی ہوں اور غیر متبدل ہوں۔ یہ کیا ضرور ہے کہ جس ذخیرے سے کوئی فائدہ اٹھایا جائے وہ لازماً تنزیل یا الہام ہی ہو۔

تیسرا باب

یہ معلوم کرنے کے بعد کہ معاملات سے تعلق رکھنے والی تمام احادیث بصیرت نبویؐ ہیں نہ کہ الہام یا تنزیل، دو سوال اور پیدا ہوتے ہیں؛ ایک یہ کہ باقی تین اجزائے دین ......عقائد، مناسک اور اخلاق...... سے تعلق رکھنے والی احادیث بھی بصیرت نبوی سے متعلق ہیں یا ان میں الہام کا بھی کچھ حصہ ہے؟ دوسرے یہ کہ الہام سے وہ کون سا خاص فائدہ ہے جو تنزیل سے نہیں ہوتا؟ لیکن ہم ان دونوں سوالوں کو یہیں تشنہ چھوڑ کر آگے بڑھتے ہیں۔ ممکن ہے آگے یا اس باب سوم کے دوران میں کہیں کہیں ضمنی بحث آ جائے۔ اب اس باب میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جب معاملات سے متعلق احادیث متبدل (Changeable) ہیں (اس لیے کہ وہ وحی نہیں) تو پھر اطاعتِ رسولؐ اور پیرویِ سنت کا کیا مطلب ہوگا اور اتباعِ سنت کیا چیز ہوگی۔

سنت کا مطلب

ہم سب سے پہلے ''مجمع البحار'' کی عبارت پیش کرتے ہیں جو لفظ سنت کے مطالب

میں لکھی گئی ہے۔علامہ طاہر پٹنی اس میں لکھتے ہیں کہ:

السنة فی الاصل الطریقة والسیرة، وفی الشرع یراد بھا ما امربه النبی صلی الله علیه وسلم ونھی عنه وندب الیه قولا و فعلا مما لم یأت به الکتاب العزیز (توسط یعنی شرح سنن ابی داؤد)

وقد یراد به المستحب سواء دل علیه کتاب او سنة اواجماع اوقیاس ومنه سنن الصلوة۔

وقدیراد ما واظب علیه النبی صلی الله علیه وسلم مما لیس بواجب فھی ثلث "اصطلاحات"......

یعنی سنت دراصل طریقے اور سیرت کو کہتے ہیں اور شرع میں یہ لفظ اصطلاحی طور پر تین معنوں میں آتا ہے۔

۱۔حضورؐ نے جو امر فرمایا یا نہی فرمائی یا جسے قولاً یا فعلاً بہتر تصور فرمایا اور وہ کتاب اللہ میں مذکور نہیں۔

۲۔صرف مستحب خواہ وہ کتاب اللہ سے ثابت ہو یا سنت (حدیث) سے یا اجماع سے یا قیاس سے۔"نماز کی سنتیں" انہی معنوں میں ہے۔

۳۔کوئی ایسا کام جو واجب نہیں لیکن حضورؐ اسے ہمیشہ کرتے رہے۔

اس عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سنت صرف وہی نہیں جس کا حضورؐ نے حکم فرمایا ہو بلکہ مستحبات بھی سنت میں دخل ہیں اور وہ امور بھی جو واجب نہیں بلکہ عادتاً یا تطوعاً حضورؐ کرتے رہے۔اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کون سی سنت ہے جس کا اتباع ضروری ہے؟

ظاہر ہے کہ مستحبات یا وہ امور جو واجب نہیں ان کا بعینہٖ اتباع "واجب" میں نہیں داخل ہو

سکتا۔ صرف وہی امور داخل ہو سکتے ہیں جو ان دونوں سے الگ یعنی پہلی شق میں داخل ہیں۔

حدیث اور سنت

حضورؐ نے جو کچھ فرمایا یا کیا، اس کا بیان ہمیں یا تو قرآن میں ملتا ہے یا احادیث میں۔ جو کچھ قرآن نے بیان کیا ہے وہ اس وقت ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے کیونکہ اس میں کسی قیل وقال کی گنجائش نہیں۔ البتہ جو کچھ احادیث میں ہے اس میں سے وہ حصے الگ کر لیجیے جو مستحبات سے تعلق رکھتے ہیں یا جو واجب نہیں تو وہی حصہ۔ باقی رہ جائے گا جو بطور امر ونہی کے حضورؐ نے فرمایا یا امر ونہی کے بغیر حضورؐ نے اسے بہتر تصور فرمایا۔ اس حصے میں اب ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ سنت کیا چیز ہے؟ آیا وہ روایتِ حدیث ہیں یا کچھ اور؟

ہم جہاں تک غور کر سکتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ واجبُ الاتباع ''حدیثیں'' نہیں بلکہ ''سنت'' ہے۔ حدیث اور سنت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ احادیث تو وہ روایات ہیں جو کتابوں میں پھیلی ہوئی ہیں اور ''سنت'' وہ طریقہ زندگی ہے جو ان روایات سے معلوم اور مستنبط ہوتا ہے یعنی سنت وہ روح ہے جو ان روایات میں قدر مشترک کی طرح جاری وساری ہے۔

اس کی ایک مثال

اس کی ایک موٹی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ حضورؐ نے حدیبیہ کے صلح نامے میں ایک شرط یہ بھی تسلیم فرمائی کہ ''اگر مکے کا کوئی آدمی حضورؐ کے پاس پہنچے (خواہ مسلمان ہو یا نہ ہو) تو اسے واپس کر دینا پڑے گا۔ لیکن اگر مدینے سے کوئی آدمی مکے والوں کے پاس آجائے تو وہ واپس نہ کیا جائے گا۔'' یہ ایک شرط تھی جو علی حالہ رہنے دی گئی۔ یہ حدیث ہے لیکن یہ

واجب الاتباع سنت نہیں۔ مشرقی و مغربی پنجاب کے درمیان عورتوں، بچوں یا قیدیوں کی بازیافت کے لیے آج بعینہٖ یہی دفعہ رکھنا ضروری نہیں۔ اس معاہدۂ حدیبیہ میں سنت کی جو روح کارفرما ہے، وہ یہ دفعہ نہیں۔ دفعہ تو حدیث ہے لیکن سنت ہے تقاضائے وقت کے مطابق معاہدہ کرنا۔ جن جن مواقع پر حضورؐ نے جو جو معاہدے فرمائے وہ عملی شکل تھی جو ظہور پذیر ہوئی۔ یہ شکل اور نوعیت نہ تنزیل تھی نہ الہام۔ صرف بصیرتِ رسول تھی جو متبدل شے ہے، فقط ممکن التبدیل ہی نہیں بلکہ بعض اوقات واجب التبدیل بھی ہے (آگے اس کی مثال آئے گی)۔

زیادہ واضح مثال

مردے کی تکفین و تجہیز کے جو طریقے احادیث میں مذکور ہیں، ان کی تفصیلات تمام کتب فقہ میں موجود ہیں۔ اس کے خاص اجزا ہیں: مردے کو بے ستری کے بغیر غسل دینا، بعض خوشبوئیں لگانا، تین (عورتوں کو چار) اجزائے کفن یعنی ازار، قمیص اور لفافے میں لپیٹنا، جنازے پر لٹا کر باری باری سے کاندھوں پر سہج سہج لے جانا، نماز جنازہ پڑھنا، بغلی یا غیر بغلی قبر میں لٹانا، ایک خلا میں محفوظ کر کے اوپر سے مٹی ڈال دینا، پھر قبر پر کوئی دیوار یا عمارت نہ بنانا، قبر پر بول و براز نہ کرنا اور اس پر ننگے پاؤں یا جوتے سمیت نہ پھرنا، ورثہ سے تعزیت کرنا وغیرہ وغیرہ۔

مردے کو آپ یوں ہی اٹھا کر جانوروں کو دے دیں۔ کفن بھی نہ دیں یا یوں ہی مٹی میں دبا دیں جب بھی مردے کا کوئی نقصان نہیں۔ آپ کے ان اہتمامات سے اسے کوئی فائدہ نہیں۔ بظاہر یہ تمام اخراجات مردے کے لیے بے فائدہ ہیں اور یہ سب انتظامات نہ کرنے سے کوئی مادی فرق نہیں پڑتا بلکہ کفن دینا تو مردے کے لیے بے ضرورت و بے معنی

معلوم ہوتا ہے لیکن ان احکام کو آپ غور سے دیکھیں، تو ایک خاص روح ان میں کارفرما نظر آئے گی اور وہ یہ ہے:

۱۔احترام بنی آدم۔

۲۔باہمی تعاون۔

۳۔زندوں کے لیے ہمدردی اور مردوں کے ساتھ بھی اسی کو باقی رکھنا۔

۴۔تذکیرو سبق آموزی۔

۵۔ ''تسلسل حیات''یعنی وجود کے غیر منقطع جوئے رواں ہونے کی تعلیم وغیرہ۔[1]

تعلیمات کی اس روح کو باقی رکھتے ہوئے اگر تکفین وتجہیز کی شکلیں اس طریقے سے جو احادیث میں مذکور ہے، مختلف ہو جائیں تو یہ خلاف سنت نہ ہوگا۔ کیونکہ اصل سنت وہ روح ہے جو اس طریقہ تجہیز و تکفین میں موجود ہے نہ کہ وہ شکلیں۔ مثلاً

۱۔ بڑے شہروں میں جہاں بمبئی کی طرح چودہ میل پر قبرستان ہے جنازے کو کندھوں پر اٹھانے والے، اتنی دور تک لے جانے کے لیے بہ مشکل ہی مل سکتے ہیں اور اگر مل بھی

---

[1] انسان مرنے کے بعد کلیتہً بے تعلق یا فنا نہیں ہو جاتا۔ اس کی ''انا'' ایغو (EGO)، تشخص (SELF) یا خودی بہر حال باقی رہتی ہے۔ یہی انا ہے جو مادی لباس جسم پہن کر دنیا میں آئی اور موت اسی تبدیل لباس کا نام ہے۔ مرنے کے بعد یہی انا ایک دوسرا لباس بدل لیتی ہے۔ کیا عجب کہ کفن اسی تبدیل لباس کی طرف ایک تمثیلی اشارہ ہو۔ پس جس طرح ایک عزیز لباس بدلنے کے بعد ہم سے بے تعلق نہیں ہو جاتا، اسی طرح لباس جسم کو بدل کر ایک نیا غیر محسوس لباس پہننے والا تشخص وانا اس تبدیل لباس (موت) کے بعد ہم سے کلیتہً فنا ہو کر بے تعلق نہیں ہوتا۔ گویا زندگی دراصل ایک جوئے رواں ہے اور یہ دنیوی زندگی، اسی کا ایک مختصر سا ابتدائی حصہ۔ مردے کے ساتھ اپنا تجہیزی اہتمام اسی غیر فانی تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی مفہوم کو ہم نے ''تسلسل حیات'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

جائیں تو جہاں ایک ہی محلے سے پے در پے جنازے نکل رہے ہوں وہاں اس کا التزام بے حد دشوار اور تکلیف مالا یطاق ہے۔ اس لیے اگر جناہ بردار گاڑیوں یا موٹروں کے ذریعے لاشوں کو قبرستان تک پہنچانے کا انتظام کیا جائے تو اسے احکام تجہیز کی بغاوت سے تعبیر نہیں کیا جائے گا۔ جب ہم ایک شہر سے دوسرے شہر میں ریلوں اور طیاروں کے ذریعے لاشوں کو لاتے ہیں تو شہر سے قبرستان لے جانے میں کون سی دینی قباحت لازم آجائے گی؟

۲۔ کپڑے کی کم یابی یا مالی فقدان یا دوسری مجبوریوں کے مواقع پر مروجہ کفن نہ دیا جائے (خواہ رواج سے کم ہو یا بالکل ہی نہ ہو) اور مردے ہی کے کپڑوں میں دفن کر دیا جائے تو سنت رسول کی مخالفت نہ ہوگی ...... سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے بوقت وفات فرمایا تھا کہ بھئی میرے ان ہی کپڑوں میں مجھے دفن کرنا کیونکہ نئے کپڑوں کی ضرورت بہ نسبت مردوں کے زندوں کو زیادہ ہے...... شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بھی اپنے ان ہی کپڑوں میں دفن کیے گئے تھے جن میں وفات پائی تھی۔ حالانکہ ان دونوں مواقع پر کپڑوں کی کم یابی یا نایابی نہ تھی۔

۳۔ قلت جگہ یا قلت وقت وغیرہ کی وجہ سے ایک ایک قبر میں کئی کئی لاشیں دفن کر دی جائیں، جیسا کہ اب بھی جنت البقیع میں ہوتا ہے، تو یہ بھی سنت نبویؐ کی مخالفت نہ کہی جائے گی، خود حضورؐ نے بھی بعض غزوات کے موقعوں پر ایسا کیا ہے۔

غرض غسل و تکفین سے لے کر تعزیت تک جتنے مراحل ہیں ان سب میں وہ روح باقی ہو جس کو اوپر بیان کیا گیا ہے اور شکلیں گردوپیش کے عصری تقاضوں کے مطابق بدل جائیں تو احادیث کی پیروی تو نہ ہوگی لیکن اتباع سنت ضرور ہوگا۔

اصل سنت

ہوسکتا ہے کہ اوپر کی پیش کردہ مثال سو فیصد فٹ نہ آسکے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ

معاملات میں پیروی حدیثوں کی نہیں ہوتی بلکہ سنت کی ہوتی ہے اور یقیناً سنت یہ نہیں کہ جو کچھ کسی کتاب میں لکھا ہوا دیکھو اسی پر عمل شروع کر دو اور سمجھو یہ کہ سنت کی پیروی ہو رہی ہے یا سمجھنے لگو کہ یہ حدیث بھی وحی ہے یا قاضی علی التنزیل ہے یا ناسخ تنزیل ہے۔ یہ باتیں سنت نہیں بلکہ اس باب میں اصل سنت یہ ہے کہ جیسا کہ کچھ آگے چل کر بھی معلوم ہوگا کہ:

۱۔ اپنے گردوپیش کا لحاظ رکھ کر اور حدود اللہ کے اندر رہ کر قانون بناؤ اور فیصلے کرو۔

۲۔ اہل حل وعقد کی رائے بھی لو۔

۳۔ تنگی وقت یا رازداری اور کوئی مصلحت مقتضی ہو تو امیر اپنی بصیرت پر فیصلہ کر دے۔

۴۔ وقتی حکم واپس لے لیا جائے۔

۵۔ حالات و مقتضیات بدل جائیں تو احکام میں تبدیلی کر دی جائے۔

۶۔ کوئی ضرورت نہ ہو تو سابق حکم برقرار رکھا جائے۔

۷۔ تجربہ اگر کسی فیصلے کو غلط ثابت کر دے تو اسے واپس لے لیا جائے۔

۸۔ بجز تنزیل کے کسی حکم کو وحی نہ سمجھا جائے اور نہ غیر متبدل تصور کیا جائے۔

۹۔ فیصلہ تفقہ و بصیرت سے کیا جائے اور تنزیل کے سوا کسی اور وحی (الہامی) کی جستجو نہ کی جائے۔

۱۰۔ اور اب ہمارے لیے یہ بھی سنت ہے کہ حضورؐ کے فیصلوں اور اہل حل وعقد کے فیصلوں کی روح تلاش کر کے اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

سنت رسولؐ اور سنت خلفائے راشدینؓ

یہ ہے دراصل وہ سنت جو واجب الاتباع ہے۔ حدیث یا روایات کی بعینہٖ اور بلفظہٖ پیروی سنت نہیں۔ آخری شق (یعنی نمبر ۱۰) کو سمجھنے کے لیے یہ حدیث بھی پیش نظر رکھنی

چاہیے کہ

علیکم بسنتی و سنۃ الخلفآء الراشدین

یعنی تم لوگ میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت پر عمل کرو۔

دیکھئے یہاں

علیکم بحدیثی و حدیث الخلفاء الراشدین

نہیں فرمایا گیا اس سے حدیث اور سنت کا فرق بخوبی واضح ہو جاتا ہے اور جو کچھ ہم اوپر کہہ آئے ہیں اس کی بھی اس سے تائید ہوتی ہے۔

اس حدیث سے ایک اور حقیقت بھی بے نقاب ہو جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ معاملات میں سنت بلاشبہ وحی کے اندر اور وحی کے مطابق تو ہوتی ہے لیکن خود وحی نہیں ہوتی، ورنہ ماننا پڑے گا کہ خلفائے راشدین بھی صاحب وحی تھے کیونکہ ان کی سنت بھی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

سنت خلفا کیا ہے؟

اب آیئے ایک نظر ادھر بھی ڈال لیجیے کہ خود خلفائے راشدینؓ حضورؐ کے فرامین کو کیا درجہ دیتے تھے؟ وہ احادیث کو دیکھتے تھے، یا سنت کو؟ اور وہ سنت نبوی کی مخصوص شکلوں کو الہام سمجھتے تھے یا بصیرت؟ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

پہلی مثال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو بیک مجلس تین طلاقیں دے تو وہ سب مل کر ایک ہی رجعی طلاق متصور ہوں گی۔ یہی فیصلہ دور صدیقی میں قائم رہا اور کچھ عرصہ تک عہد فاروقی میں بھی باقی رہا۔ لیکن پھر حضرت عمرؓ نے اعلان فرمایا کہ

ایسی طلاق اب رجعی نہیں بلکہ مغلظہ قرار دی جائے گی۔ اس کے بعد سے آج تک (چند بیدار مغز اہل علم کو چھوڑ کر) ساری امت ایسی طلاق کی تغلیظ ہی کو وحی منزل سمجھے ہوئے ہے۔ ذرا سوچیے اگر حضرت عمرؓ حضورؐ کے فیصلے کو (جو حضورؐ کے بعد بھی کئی سال تک قائم رہا) وحی سمجھتے تو کیا اسے بدلنے کی جرأت کر سکتے تھے؟ حقیقت صرف اتنی ہے کہ سیدنا عمرؓ نے حدیث کی پیروی نہیں بلکہ سنت کا اتباع کیا اور اس معاملے میں سنت یہ تھی کہ حالات موجودہ کے مقتضیات کے مطابق فیصلہ ہو۔

ایک اور بات

اسی سلسلے میں لگے ہاتھوں یہ بھی سوچیے کہ جب سیدنا عمرؓ نے حضورؐ کے اس فیصلے کو درجہ تنزیل والہام نہ دیا بلکہ ایک متبدل چیز سمجھتے رہے تو خود سیدنا عمرؓ کا فیصلہ ایک غیر متبدل چیز کس طرح بن سکتا ہے اور اب مقتضیات حاضرہ کے مطابق اس میں ردو بدل کیوں نہیں ہو سکتی؟ کیوں اسے ساری امت ایک ناقابل تبدیل حقیقت سمجھ کر سینے سے لگائے ہوئے ہے؟ درآں حالیکہ سیدنا عمر کو خود اپنے اس فیصلے پر شدید ندامت تھی۔ دیکھیے اغاثۃ اللھفان۔

دوسری مثال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی زانی پر دو حدیں جاری نہیں فرمائیں۔ لیکن حضرت علی نے بعض زانیوں کو جلد اور رجم دونوں کی اکٹھی سزا دی۔

تیسری مثال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کو آگ کی سزا نہیں دی لیکن سیدنا علیؓ نے نصیریوں کو زندہ آگ میں جلوا دیا۔

چوتھی مثال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات تک مولفۃ القلوب کو زکوٰۃ ملتی رہی لیکن حضورؐ کے بعد ہی سیدنا ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کے مشورے سے یہ زکوٰۃ بند کردی اور آج تک ہمارے فقہا اسی حکم بندش سے چمٹے ہوئے ہیں۔

ایک غور طلب بات

حضورؐ مولفۃ القلوب کو جو زکوٰۃ دیتے تھے وہ خود حضورؐ کا حکم نہ تھا بلکہ قرآنی حکم تھا

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ (٩:٦٠)

اب ہماری ستم ظریفی ملاحظہ ہو۔ ہم یہ تو تسلیم کرتے ہیں، ایک قرآنی حکم کو جس پر خود رسول کا بھی ساری عمر عمل رہا، حضرت ابوبکرؓ (بہ مشورہ حضرت عمرؓ) منسوخ کر سکتے ہیں یا بدل سکتے ہیں لیکن حضورؐ کے فرامین جو الہام سے بھی تعلق نہ رکھتے ہوں، ناقابل تبدیل ہیں اور ابدیت کے حامل ہیں اور ان کو جوں کا توں قیامت تک رہنا چاہیے۔ بلکہ یوں کہیے کہ شیخین کا فیصلہ تو ناقابل ترمیم ہے لیکن قرآنی حکم میں ترمیم ہو تو مضائقہ نہیں۔ ہمارے پاس اس مشکل کا آسان حل موجود ہے۔ لیکن جو قرآن کی طرح رسول اور صحابہ کے فرامین کو ابدی سمجھتا ہو اسے اس پیچیدگی کا حل تلاش کر لینا چاہیے۔

مثالوں سے کتاب کی ضخامت بڑھانا مقصود نہیں۔ استشہاد کے لیے چند مثالیں کافی ہیں۔ ورنہ اس کی مثالیں سینکڑوں موجود ہیں۔[1] ان سب باتوں پر غور کیجیے تو اتباع حدیث اور اتباع سنت کا فرق بخوبی واضح ہو سکتا ہے۔ نیز سنت خلفا کا جو حکم دیا گیا ہے (اور جس کی

---

[1] مصنف موصوف کی ایک مطبوعہ کتاب ''اجتہادی مسائل'' ملاحظہ ہو۔

چند مثالیں آپ نے ملاحظہ فرمائیں) اس کا مطلب بھی اچھی طرح عیاں ہو سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حدیثیں واجب الاتباع نہیں بلکہ سنت واجب الاتباع ہے۔ حضور کی سنت اس لیے کہ

لقد کان لکم فی رسول الله اسوة حسنة

اور خلفائے راشدین کی سنت اس لیے کہ ان کی زندگیوں سے اتباع سنت کے معنی سمجھ میں آجاتے ہیں جیسا کہ اوپر کی چند مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے۔

اتباع حدیث کی ایک مشکل

اگر اتباع سنت کی بجائے اتباع حدیث پر زور دیا جائے تو بعض ایسی مشکلات درپیش ہوتی ہیں کہ کوئی حل نہیں نکلتا۔ زندگی میں ایسے مراحل سے بھی گزرنا پڑتا ہے جہاں اتباع حدیث تقریباً ناممکن سا ہو جاتا ہے اور وہاں بجز اتباع سنت کے چارہ نہیں ہوتا۔ ایک مثال سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے۔

دیکھیے قرآن پاک نے زکوٰۃ کا حکم تو دیا ہے لیکن اس کا کوئی نصاب نہیں بتایا ہے کہ اتنا ہو تو اتنا دو۔ احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ چاندی کے لیے دو سو درہم اور سونے کے لیے بیس دینار نصاب ہے۔ اب آپ کو ایک تاجر سے مال تجارت کی زکوٰۃ وصول کرنی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس حساب سے زکوٰۃ وصول کی جائے؟ اگر دو سو درہم کو نصاب قرار دیا جائے تو کم و بیش ساٹھ ستر روپے کی قیمت کے مال پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔ گویا پان اور سگریٹ بیچنے والے سے بھی زکوٰۃ لینی چاہیے۔ اور اگر بیس دینار کو نصاب بنایا جائے تو کم و بیش آٹھ نو سو روپے کے مال پر زکوٰۃ واجب ہو گی۔ اب سوال یہ ہے کہ زکوٰۃ کس حساب سے لی جائے؟ چاندی (درہم) کو مقدار نصاب قرار دے کر یا سونے (دینار) کو نصاب

تجویز کرے؟ حضورؐ کے عہد میں دوسو درہم اور بیس دینار دونوں ہم قیمت تھے۔ اس لیے دونوں میں جس کو دل چاہے نصاب قرار دے سکتے تھے اور آج دونوں میں ستر اسی گنے کا فرق ہوگیا ہے۔ اب دیکھیے اگر آپ چاندی کے حساب سے مال تجارت کی زکوٰۃ وصول کرتے ہیں، تو منجملہ دوسری خرابیوں کے ایک خرابی یہ لازم آتی ہے کہ سونے کا حساب ترک کرنا پڑتا ہے۔ گویا حدیث کے ایک حصے سے دست بردار ہونا پڑتا ہے اور اگر سونے کا حساب رکھتے ہیں تو چاندی والے حصہ حدیث کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اگر دونوں کو ملا کر اوسط نکالا جائے اور اسے مقدار نصاب قرار دیا جائے تو حدیث کے دونوں حصوں کو چھوڑ کر ایک نئی ''بدعت'' ایجاد کرنی پڑے گی۔

غرض قرآن پاک نے مصلحتاً کسی نصاب کا ذکر نہیں فرمایا۔ کیونکہ یہ باتیں حالات زمانہ کے ساتھ بدلتی رہنے والی ہیں۔ یہاں اس باب میں حدیث کا اتباع ممکن ہی نہیں بلکہ سنت ہی کا اتباع ہوسکتا ہے اور وہ سنت یہ ہے کہ حکومت اسلامیہ اپنے حالات، عام ماحول، معیار زندگی، آمدنی وخرچ، غرض تمام مقتضیات حاضرہ کو سامنے رکھ کر ایک نصاب مقرر کردے۔ معیار نہ چاندی ہے نہ سونا۔ بلکہ ثمنیت ہے جو متبدل چیز ہے۔ مال مسروقہ کے نصاب کو بھی اس پر قیاس کرنا چاہیے۔ حدیث میں تو اتنا آیا ہے کہ ''شی تافہ'' (معمولی اور ادنیٰ چیز) پر قطع ید نہیں۔ لیکن شی تافہ کا اطلاق کسی جگہ کتنی قیمت کی چیز پر ہوگا۔ اس کا فیصلہ وقت کے تقاضوں سے ہوگا۔

حدیث اور سنت کی مثال

عموماً یہ نظر آتا ہے کہ ایک طبقہ ہر حدیث کو بعینہٖ سنت سمجھ کر اس کے اتباع کو فرض قرار دیتا ہے اور دوسرا، سنت کو بھی حدیث ہی تصور کرکے واجب الترک سمجھتا ہے۔ حدیث اور

سنت کے لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حدیث ہیں شاخیں اور سنت اس کے پھل ہیں۔ اگر کوئی شخص پھلوں کی بجائے شاخوں کو کھانا شروع کر دے کہ اصل یہی ہے جب بھی غلط ہے اور اگر پھلوں کو اس لیے کھانا چھوڑ دے کہ یہ شاخوں کی بدولت پیدا ہوئے ہیں اور شاخیں کھائی نہیں جاتیں، جب بھی صحیح نہیں۔ حدیثوں کو آپ شاخ قرار دے سکتے ہیں جو قرآن کی جڑ سے برآمد ہوئی ہیں اور سنت ان ہی شاخوں کے ثمرات ہیں۔ خود شاخیں ثمر نہیں جڑ کی ہر حال میں حفاظت کی جائے گی، اور شاخوں میں کسی شاخ کو باغبان اپنی بصیرت سے کاٹ کر الگ بھی کر سکتا ہے۔ اس قطع و برید سے اس کا مقصد پھلوں سے محروم کرنا نہیں بلکہ دوسری شاخوں سے وہی ثمرات زیادہ بہتر طریقے سے حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہی خلفائے راشدینؓ نے کیا اور یہی حضورؐ کا بھی منشا تھا۔ مصیبت یہ ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ ہر شاخ کو اس لیے کاٹ پھینکنا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ عین ثمرات نہیں اور کچھ لوگ ہر شاخ کو اس انداز سے دانتوں کی مضبوط گرفت سے پکڑے ہوئے ہیں کہ گویا یہی عین ثمر ہے بلکہ بعض تو ان ہی شاخوں پر پانی ڈالتے چلے جاتے ہیں خواہ جڑ سوکھتی چلی جائے۔

سنت کا غلط مفہوم

اگر فی الواقع سنت کا یہی مفہوم ہو کہ جو کچھ احادیث میں لکھا ہے، لفظاً لفظاً بعینہٖ اس کی پیروی کی جائے تو ہمیں چاہیے کہ ہم عربی زبان میں تمام گفتگوئیں کیا کریں۔ سوچیں بھی عربی زبان میں اور خواب بھی دیکھیں عربی میں، کیونکہ حضورؐ نے ساری عمر عربی زبان میں گفتگو فرمائی، عربی میں تفکر فرمایا اور عربی ہی میں خواب دیکھے اور حضورؐ کے بعد تمام صحابہ و تابعین بھی اسی "سنت" پر عمل کرتے رہے۔ ایسی متواتر سنت کو جس کا تواتر قرآن کے تواتر سے کم نہیں کیوں چھوڑ دیا گیا ہے؟ اور زبان ہی پر کیا موقوف ہے؟ خوراک، پوشاک،

سواری، آلات حرب وغیرہ میں بھی ویسی ہی ہو بہو نقل کرنی چاہیے اور فقط اتنا ہی نہیں بلکہ وہ "بدعتیں" ترک بھی کرنی چاہئیں جو احادیث سے ثابت نہیں۔ چاول یا پلاؤ کھانا، چائے یا سوڈا لیمونیڈ پینا، برف استعمال کرنا، پان کھانا، ریل، موٹر یا طیارے پر سفر کرنا، اخبار اور رسالے نکالنا، ریڈیو پر خبریں سننا، تار اور ٹیلفون سے بات کرنا، علم حدیث وفقہ پر کتابیں لکھنا اور پریس میں چھپوانا، دخانی جہاز پر حج کو جانا، لاؤڈ سپیکر پر تقریر کرنا، گرم اوورکوٹ پہننا، گھڑی، فونٹین پن اور عینک استعمال کرنا...... وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے کوئی چیز بھی حدیث سے ثابت نہیں (لہٰذا انہیں سنت بھی نہ ہونا چاہیے) نہ صحابہ وتابعین کو ان چیزوں سے واسطہ رہا۔ جس طرح یہ باتیں احادیث میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے بدعت نہیں اسی طرح وہ تمام باتیں جو احادیث میں مذکور ہیں، سنت نہیں۔

چند لذیذ اور چند متروکہ سنتیں

غالباً یہی سنت کا غلط مفہوم ہے جس کی وجہ سے ہماری عملی زندگی میں چند لذیذ سنتیں تو بہت بڑے اجر کا موجب سمجھی گئی ہیں اور چند کڑوی مگر اصلی سنتیں فراموش ہوگئیں ہیں۔ لذیذ سنتیں یہ ہیں:

میٹھا کھانا، شہد چاٹنا، متعدد بیویاں کرنا، افطار میں جلدی اور سحری میں تاخیر کرنا، دعوت منظور کرنا، ہدایا قبول کرنا، پنیر کھانا، کدو اور بھنا ہوا گوشت کھانا، قیلولہ کرنا، سرمہ لگانا اور بردیمانی اوڑھنا وغیرہ۔

بعض ان سنتوں کو بھی سن لیجیے جو احادیث کی روح اور سنت کی جان ہیں لیکن ہماری عملی زندگی کو ان سے اتنا تعلق نہیں جتنا مذکورہ لذیذ سنتوں سے ہے۔ مثلاً غیر اللہ کی غلامی سے نکلنا، امت میں تفریق نہ پھیلانا، فروع میں رواداری سے کام لینا، اپنی بصیرت کو ترک

نہ کرنا، روایات اور اجتہادات ائمہ کو تنزیل کا درجہ نہ دینا، حب جاہ و مال کو ترک کر دینا، سب سے الگ ہو کر جماعت بندی نہ کرنا، اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے قتال کرنا، فرقے بندی کی لعنت سے کنارہ کش رہنا وغیرہ، یہ ہیں وہ سنتیں جو واقعی سنتیں ہیں۔ لیکن سنت کا مفہوم صرف احادیث کی لفظی پیروی رہ جائے تو لذیذ سنتوں کو چھوڑ کر کڑوی سنتوں کی طرف کون آئے؟

حدیث اور تفقہ

ہم نے ابتدا سے اب تک جو کچھ لکھا ہے اس مفروضے پر لکھا ہے کہ جو احادیث اب تک صحیح سمجھ کر درجِ کتاب کی گئی ہیں وہ صحیح ہی ہوں گی مگر حقیقت یہ ہے کہ احادیث کے معاملے میں بعض اور بھی پیچیدگیاں ہیں جن کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک فقیہ جہاں یہ تلاش کرتا ہے کہ فلاں حدیث کی روح کیا ہے اور اس سے کون سی سنتیں ماخوذ ہوتی ہیں، وہاں اس سے پہلے اسے ایک چیز اور بھی دیکھنی پڑتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ راوی جو کچھ روایت کر رہا ہے...... وہ صحیح بھی ہے یا نہیں؟ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ایک محدث کسی حدیث کو صحیح سمجھ کر بیان کرے یا لکھے تو وہ فی الواقع صحیح بھی ہو۔ یہاں آ کر فقیہ کا درجہ ایک نرے محدث سے بہت بلند ہوتا ہے۔

محدث و فقیہ کا فرق

ایک مثال سے یہ حقیقت بخوبی بے نقاب ہو سکتی ہے۔ سیدنا عبداللہ ابن عمرؓ کا پایہ حدیث دانی میں بے شمار صحابہ سے بلند تر تھا۔ لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ ان کا مقام تفقہ میں وہ نہ تھا جس پر سیدہ عائشہؓ، حضرت علیؓ اور سیدنا عمرؓ وغیرہم فائز تھے۔ سیدنا عبداللہؓ بن عمر (یا سیدنا عمرؓ) ایک حدیث بیان فرماتے ہیں کہ ''رشتے داروں کے رونے پیٹنے سے مردے پر عذاب ہوتا ہے۔'' سیدنا عائشہؓ نے یہ سنا تو فرمایا کہ ''ابن عمرؓ کو مفہوم حدیث سمجھنے میں

مغالطہ ہو گیا ہے۔ حضورؐ کسی یہودیہ کے سامنے سے گزرے جس کی موت پر اس کے گھر والے رو رہے تھے......اس وقت حضورؐ نے فرمایا کہ: گھر والے رو رہے ہیں اور اس میت پر عذاب ہو رہا ہے۔ یہ دو الگ الگ باتیں یہ جو حضورؐ نے فرمائیں۔ ابن عمرؓ کو اس سے یہ غلط فہمی ہوئی کہ رشتے داروں کے رونے کی وجہ سے اس یہودیہ پر عذاب ہو رہا ہے۔'' اس کے بعد ابن عمر نے رجوع فرمایا۔ بعض روایتوں میں ابن عمرؓ کی بجائے خود سیدنا عمرؓ بن خطابؓ، سیدنا ابو ہریرہؓ اور بعض دوسرے صحابہ کا نام ہے۔ بہرکیف حضرت عائشہؓ نے اس حدیث کی توجیہ بیان کرنے کے بعد یہ آیت پڑھی کہ

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۶:۱۶۴)

ایک کے گناہوں کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا۔

گویا آپ نے یہ واضح فرما دیا کہ رشتے داروں کے رونے کا بوجھ خود رشتے داروں پر ہوگا نہ کہ مرنے والی یہودیہ پر۔

اس روایت کی ایک توجیہ

ہم اس روایت کی ایک دوسری توجیہ بھی کر سکتے ہیں۔ یعنی دستور جاہلیت کے مطابق اگر مرنے والا اپنے رشتے داروں کو زور شور سے رونے پیٹنے کی وصیت کر جائے تو اس رونے پیٹنے کا عذاب اس مردے پر ہوگا ممکن ہے اس یہودیہ کے ساتھ یہی ہوا ہو۔ اس صورت میں رشتہ داروں کے رونے کا بوجھ اس یہودیہ پر ہوگا جس کا حضورؐ نے اظہار فرمایا ہوگا۔ اندریں صورت رشتے داروں کا رونا یہودیہ پر عذاب ہونے کی علت بن سکتا ہے۔ اور

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۶:۱۶۴)

سے اس کا کوئی تعارض نہیں ہوتا۔ لیکن اس صورت میں یہ واقعہ خاص ہوگا، عام قاعدہ نہیں بنے گا جیسا کہ ابن عمر نے خیال کر لیا کہ رشتے داروں کے رونے سے مرنے والے پر

عذاب ہوتا ہے۔

اس روایت کے شاندار نتائج

اس روایت سے جس میں ابن عمرؓ کا ایک حدیث بیان کرنا اور عائشہؓ کا ٹوکنا مذکور ہے، مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:

۱۔ حضورؐ کے فیض یافتہ صحابہ میں بھی ایسے سادہ لوح مسلمان تھے جو وفور علم حدیث کے باوجود پورے اخلاص اور سچائی کے ساتھ ایسی روایتیں بیان کر دیتے تھے جو تنزیل کے خلاف ہوتی تھیں۔ مثلاً ابن عمرؓ کا دوسرے موقعے پر یہ حدیث بیان کرنا کہ ''مہینہ انتیس دن کا ہوتا ہے'' حضرت عائشہؓ نے اس کی بھی اصلاح فرمائی کہ ''مہینہ انتیس دن کا بھی ہوتا ہے۔''

۲۔ بڑے سے بڑا محدث بھی ایسی غلطیوں میں پڑ سکتا ہے۔

۳۔ اگر ان کی بروقت اصلاح نہ کر دی جاتی تو مستقبل میں اس کا عقیدے کے طور پہ پھیل جانا بعید نہ تھا۔

۴۔ حضرت عائشہؓ نے اس حدیث کو (اور بہت سے مواقع پر دوسری حدیثوں کو بھی) دلائل سے غلط بتایا لیکن آپ کو ''منکرہ حدیث'' کا لقب کسی نے نہیں دیا۔

۵۔ اگر اس قسم کی غلطی کوئی دوسرا محدث کرے تو اس کو ناممکن نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ بالکل ممکن ہے اور کوئی تعجب کی بات نہیں۔

۶۔ اور اگر کوئی شخص اس محدث کی اصلاح دلائل سے کسی دور میں بھی کرے تو یہ عین حق ہوگا، اور اس کا حق اسے پہنچتا ہے۔

۷۔ ایسی اصلاح کے بعد اس محدث کو فوراً اپنی غلطی تسلیم کر لینی چاہیے۔

۸۔ اگر کسی نے براہ راست زبان رسالت سے حدیث سنی ہو جب بھی مغالطہ فہم کا

امکان ہے۔ چہ جائیکہ کسی کتاب میں حدیث لکھی دیکھی ہو یا روایت در روایت ہو کر پہنچی ہو۔

۹۔ حضورؐ تنزیل، عقل یا مشاہدے کے خلاف کوئی بات نہیں فرما سکتے تھے۔

۱۰۔ بلکہ ایسی ہر حدیث خود راوی کی غلط فہمی ہے نہ کہ نعوذ باللہ رسول کی۔

۱۱۔ ہوسکتا ہے کہ ایک عالم حدیث غلطی کا علم نہ ہونے کی وجہ سے عرصہ دراز تک ایک غلط روایت سے چمٹا رہے اور بعد والے بھی اسی طرح اس مغالطے میں پڑے رہیں۔

۱۲۔ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ جو بات رسول کی طرف منسوب ہو اس کا انتساب درست ہی ہو۔

۱۳۔ فقیہ کا فرض ہے کہ جب ایسی غلطی کا علم ہو تو بے تامل اس کی اصلاح کر دے۔

۱۴۔ حدیثیں اگر ''ما انزل اللہ'' ہوتیں تو تنقید یا اصلاح کی بجائے سنتے ہی اس کے آگے بھی (آیت قرآنی کی طرح) گردن جھکا دی جاتی۔

۱۵۔ حدیث اگر قاضی علی القرآن یا ناسخ قرآن ہوسکتی تو ابن عمرؓ اس سے رجوع نہ کرتے بلکہ ام المومنین سیدہ عائشہؓ ''لاتزر وازرۃ وزر اخری'' سے رجوع کر لیتیں۔

۱۶۔ غلط روایات کی اصلاح ضروری ہے ورنہ اس سے غلط عقیدہ وخیال بھی پھیل سکتا ہے۔

۱۷۔ قرآن ہو یا حدیث دونوں کے فہم کے لیے تفقہ ضروری ہے۔

۱۸۔ جس طرح کوئی آیت یاد کر لینا اس بات کی ضمانت نہیں کہ اس کا صحیح مطلب بھی سمجھ لیا گیا ہے، اسی طرح احادیث کا مجموعہ یک جا کر لینا یا زبانی یاد کر لینا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ تفقہ بھی پیدا ہو گیا جو صحیح وسقیم کا امتیاز کر لیتا ہے یا روح سنت کو معلوم کر لیتا ہے۔

۱۹۔ جب محتاط صحابہ میں غلط مضمون کی احادیث کو یاد رکھنے والے اور غلطی معلوم ہونے والے پر اس کی اصلاح کرنے والے موجود تھے تو بعد کے کسی دور میں بھی ان دونوں طرح

کے لوگوں کے امکان کو ختم نہیں سمجھنا چاہیے۔

ہم نے صرف ایک روایت حدیث اور اس کے نتائج مستنبطہ کو پیش کیا ہے ورنہ ایسی بیسیوں مثالیں موجود ہیں جن سے مختلف قسم کے نتائج نکلتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ یہ مثال رسول سے براہ راست سنی ہوئی حدیث کی ہے۔ عہد نبوی کی روایت در روایت سنی ہوئی حدیث کو اس پر قیاس کر لینا کچھ مشکل نہیں اور پھر عہد نبوی کے بعد اور بہت بعد کی روایت در روایت در روایت سنی یا لکھی ہوئی احادیث کا اندازہ کر لینا اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔

اپنے طے کردہ رجحانات کو الگ رکھ کر غور فرمایئے۔ کیا ایسی چیز ما انزل اللہ کی ہم پلہ اور من جمیع الوجوہ مثلہ معہ ہو سکتی ہے؟ اگر کوئی حدیث مثلہ معہ ہو سکتی ہے تو صرف ''القائی حیثیت'' سے ہو سکتی ہے اور وہ بھی فقط وہ حدیث جس کا الہام ہونا قطعیت کے ساتھ یا ناقابل انکار قرائن سے معلوم ہو جائے، اور ظاہر ہے کہ معاملات میں کسی حدیث کا الہام ہونا بالکل بعید از قیاس ہے جیسا کہ پچھلے اوراق میں واضح ہو چکا ہے۔

الہامی حصہ حدیث

احادیث میں کتنا حصہ الہامی ہے؟ یہ بحث ہمارے موضوع میں اس وقت داخل نہیں۔ سرسری طور پر ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ دو تین مقامات ایسے ہیں جہاں احادیث کو الہامی مانا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

الف۔ حدیث قدسی جس میں متکلم خدا ہوتا ہے، اگرچہ الفاظ حضورؐ کے ہوتے ہیں جیسے:

انا عند ظن عبدی بی۔ یا

......الا الصوم فانه لی۔ وغیرہ۔

ب: اخبار عن الغیب، جس میں گزشتہ واقعات، مستقبل کی خبریں یا حال کے غیبی انکشافات وغیرہ سب داخل ہیں۔

اسی طرح کے دو ایک گوشے اور تلاش کیے جا سکتے ہیں جن سے تعلق رکھنے والی احادیث کو الہامی قرار دیا جا سکتا ہے اور وہ بھی اس وقت جب کہ تمام شرائط صحت پائی جائیں۔ اس کی سند اور سلسلۂ روایت میں کوئی شک وشبہ نہ ہو۔ تنزیل کے خلاف نہ ہو، خود اصول سنت سے متعارض نہ ہو، تاریخ صحیح یا مشاہدہ وعقل وغیرہ اس کی تکذیب نہ کرتے ہوں وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہ تمام مقامات جہاں الہامی حدیث ہونے کا امکان ہے معاملات کی دنیا سے خارج ہیں۔ معاملات کے متعلق جتنی بھی احادیث ہیں وہ بشرط صحت سر تا سر بصیرت نبویؐ کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اور یوں بھی دیکھیے تو ہر روز بدلنے والی چیز کے لیے ہر آن الہاموں کی بارش کی کوئی خاص ضرورت بھی معلوم نہیں ہوتی۔ سوچیے اگر پورے دین کے ہر ہر جز کا تعلق براہ راست تنزیل یا الہام سے ہو تو رسول کی بصیرت واجتہاد سے کسب نور یا اسوہ حسنہ پر عمل کے لیے کون سا موقع باقی رہ جائے گا؟

چند روشن نتائج

پس جب معاملات سے تعلق رکھنے والی تمام روایات، نبوی اجتہاد وبصیرت ہی کا نتیجہ ہیں نہ کہ الہام کا تو اس کے بعد خود بخود چند اصولی نتائج سامنے آ جاتے ہیں:

۱۔ یہ ما انزل اللہ نہیں بلکہ حدود اللہ کی نہایت واضح عملی تعبیرات اور صحیح پیروی ہیں جو حدود اللہ کے اندر رہی ہیں، خود عین حدود اللہ نہیں۔

۲۔ یہ اسی دور، اسی ماحول اور ان ہی مخصوص حالات کے لیے صحیح ترین اور مناسب

ترین احکام ہیں، اور چونکہ معاملات متبدل ہوتے ہیں اس لیے اس دور کی بہت سی باتیں کسی دوسرے دور میں قابل ردو بدل بھی ہوسکتی ہیں اور یہ تبدیلی خلاف سنت نہیں بلکہ عین پیروی سنت اور عین منشائے نبوی کا اتباع ہوگا۔

۳۔ یہ سارے احکام ہر دور میں واجب التبدیل نہیں بلکہ وہ حصہ علی حالہ باقی رہے گا، اگر ضرورت تبدیل نہ ہو۔

۴۔ جو حصہ قابل تبدیل ہو اس میں بھی وہ روح ملتی ہے جو آج یا کسی دور میں ہماری رہنمائی کرے گویا نہ سب قابل ترک ہیں اور نہ کل بعینہٖ واجب العمل۔

۵۔ حدود ما انزل اللہ کے خلاف اگر کوئی حصہ ہو تو قبول نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ قابل عمل ہی کیوں نہ نظر آتا ہو۔

استحسان

ان ہی سب باتوں کے مجموعی لحاظ و خیال کا نام ہے، ''استحسان'' اور قانون سازی کے لیے اس سے مفر ممکن نہیں۔ استحسان کے معنی ہیں مصالح وقت کو پیش نظر رکھ کر مسائل کی تدوین کرنا۔ غالباً اس کی ضرورت کو سب سے پہلے امام اعظم ابوحنیفہ نے محسوس فرمایا تھا اور اس کے بعد کوئی دور ایسا نہیں گزرا ہے جب کہ اس اصول کو اپنایا نہ گیا ہو۔ آج بھی اس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔[1]

---

[1] استحسان کی تعریف حنفیہ کے نزدیک یہ ہے۔

هو ترك القياس والاخذ بما هو اوفق للناس۔

یعنی (مبنی بر نص و اجماع) قیاس کو ترک کر کے ایسی شکل اختیار کرنا جو انسانوں کے لیے زیادہ نفع بخش ہو۔ (مبسوط ج ۱۰ ص ۱۴۵)

خیالات کا انتشار اور ٹکراؤ

اس وقت مختلف اصولی نظریات اس سلسلے میں سامنے آ رہے ہیں جن میں تناقض، خلط مبحث اور خیالات کا انتشار نظر آتا ہے۔ کتاب آئین میں عقائد، عبادات اور اخلاق سے بحث نہیں ہوتی، صرف معاملات ہی سے بحث ہوتی ہے۔ بس یہیں متعین کر لیجیے کہ تدوین آئین کے وقت معاملات کے باب میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (نہ کہ احادیث) کے موقف ومقام کیا ہیں؟

افسوس ناک روش

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف قرآن کے سوا ہر چیز کو غیر وحی ہونے کی وجہ سے ظن محض اس لیے ساقط الاعتبار قرار دیا جا رہا ہے اور دوسری جانب ہر دینی علم وفن کو عین وحی بتایا جا رہا ہے۔ صاف الفاظ میں ممکن ہے اس کا اظہار نہ ہوتا ہو لیکن عمل کی دنیا میں یہی کچھ نظر آ رہا ہے۔ کچھ لوگ ایسے دیکھنے میں آئے ہیں کہ ان کے سامنے اقبال کا شعر پڑھیے تو جھوم

اسے بعض مالکیہ بھی تسلیم کرتے ہیں اور اس کی تعریف یوں کرتے ہیں:

هو الالتفات الى المصلحة والعدل

یعنی مصلحت عامہ اور عدل کے تقاضے کو پورا کرنا (اعتصام شاطبی ج ۲ ص ۱۱۶۔۱۱۹) حنابلہ بھی اسے تسلیم کرتے ہیں (الاحکام للآمدی ج ۳ ص ۱۳۶)

علاوہ ازیں ایک اور چیز استحسان ہی سے ملتی جلتی ہے جسے امام مالک "مصالح مرسلہ" کہتے ہیں۔ اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ مصلحت ایک شرعی دلیل ہے۔ (اعتصام شاطبی ج ۲ ص ۹۵۔۱۱۶)

امام شافعی استحسان کے قائل نہیں لیکن امام غزالی شافعی ایک اور چیز کے قائل ہیں جسے وہ "استصلاح" کہتے ہیں، اس کا مقصد بھی مصلحت کو پیش نظر رکھنا ہے۔ بشرطیکہ وہ اشد ضروری ہو۔

جائیں گے۔ مثنوی رومی کا شعر گنگنایئے سر دھننے لگیں گے۔ برکلے، نٹشے، آئنسٹائن اور برگساں کے فلسفے بیان کیجیے ہمہ تن گوش بن جائیں گے۔ یہ سب کچھ ہوگا لیکن اگر حدیث رسول کہہ کر کچھ سنایئے تو نگاہوں میں غضب، دماغ میں جذبہ تردید اور دل میں اعراض و بے رخی کے انداز پیدا ہو جائیں گے اور دوسری طرف کچھ احباب ایسے بھی دکھائی دیں گے کہ ان کے سامنے کتنی ہی واضح الدلالہ آیت پڑھیے وہ اس پر غور کرنے کی بجائے پہلے یہ غور فرمائیں گے کہ اس کے خلاف کوئی روایت تو موجود نہیں؟ یعنی اگر ہو تو آیت قرآنی کی تاویل کر دی جائے ورنہ روایت کے سہارے کی وجہ سے مضمون آیت کو بھی مان لیا جائے۔

ایک دلچسپ مثال

ہم یہ گفتگو محض برائے وزن بیت نہیں کر رہے۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ چونکہ ہم نے ''منکرین روایات'' پر تنقید کی ہے اس لیے ہم نے توازن قائم رکھنے کے لیے ''روایت پرستوں'' پر بھی ایک الزام گھڑ کر لگا دیا ہے۔ ایسا نہیں۔ ایک مثال سے ہماری گفتگو کی کسی قدر تصدیق ہو جائے گی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنی مشہور عالم کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں یوں فرماتے ہیں:

......دوسری مثال حضرت عمرؓ کا یہ مسلک ہے جو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے کہ جنبی اگر پانی نہ پائے تو اس کے لیے تیمّم کافی نہیں...... حضرت عمار بن یاسرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے ایک سفر کا حال بیان کیا کہ میں جنبی ہو گیا اور پانی نہ ملا تو مٹی میں لوٹ گیا اور بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا یہ طریقہ تیمّم بیان کیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اس کی کیا ضرورت تھی؟ پھر حضورؐ نے اپنے ہاتھوں کو زمین پر مار کر اپنے ہاتھوں اور چہروں پر پھیرتے ہوئے فرمایا کہ یوں کر لینا کافی تھا۔ حضرت عمرؓ نے کسی پوشیدہ علت کی وجہ سے اسے قبول نہ کیا۔ لیکن بعد میں یہ حدیث اس قدر مستفیض ہوئی کہ اس کی عدم صحت کا

وہم جاتا رہا، اور بالاتفاق یہ لائق عمل ہوگئی...... [1]

آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ ہم جیسے کم علموں کو جنھیں سال میں ایک ختم قرآن کی نوبت بہ مشکل آتی ہے ایک جگہ نہیں، دو دو جگہ (سورۃ نساء رکوع ۷ میں اور سورہ مائدہ رکوع ۱ میں) قرآن کے یہ الفاظ دکھائی دیتے ہیں کہ:

......أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا

(۴۳:۴) و (۶:۵)

---

[1] شاہ صاحب کی اصل عبارت یوں ہے:

ومثال آخر روى الشيخان انه كان من مذهب عمر الخطاب ان التيمم لا يجزى للجنب الذي لا يجد مآء فروى عنده عمار انه كان مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فى سفر فتمعك فى التراب فذكر ذلك لرسول الله عليه وسلم فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم انما كان يكفيك ان تفعل هكذ اوضرب بيديه الارض فمسح بهما وجهه ويديه۔ فلم يقبل عمرولم نيهض عنده حجة لقادح خفى رآه فيه حتى استفاض الحديث فى الطبقة الثانيه من طرق كثيرة واضمحل وهم القادح فاخذوا به۔

(حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۱۱۴)

ترجمے کے الفاظ ہمارے نہیں بلکہ "علوم الحدیث" مولفہ مولانا شاہ عزالدین سلمہ اللہ تعالیٰ ندوی پھلواروی سابق خطیب شاہی مسجد لاہور کے ہیں جنھوں نے اپنی کتاب "علوم الحدیث" میں لکھا ہے۔

یعنی اگر تم عورتوں کو چھولو (صحبت کرلو) اور پانی نہ ملے تو تیمم کرلو۔

لیکن اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو آخر عمر تک یہ آیات نظر نہ آئیں یا اگر دیکھی ہوں گی تو سمجھ نہ سکے اور اسی مسلک پر آخر دم تک قائم رہے کہ جنبی کے لیے (اگر وہ پانی نہ پائے) تیمم کافی نہیں۔ روایت گھڑنے والے کو یہ بھی خیال نہ آیا کہ وہ کس شخصیت کے بارے میں اور کیا کہہ رہا ہے؟ زیادہ پرلطف بات یہ ہے کہ عمار بن یاسرؓ نے بھی حضرت عمرؓ کے سامنے آیت تیمم نہیں پڑھی۔ شاید ان کی نظروں سے بھی آیت نہ گزری ہوگی۔ بہرحال آیت یاد نہ ہو مگر انہیں حدیث یاد تھی اور وہی حضرت عمرؓ کے سامنے پیش بھی کی۔ پھر ایک اور تماشا دیکھئے عمار بن یاسرؓ جیسے صادق القول اور زبان رسالت سے براہ راست سننے والے راوی کی بیان کردہ حدیث کو بھی حضرت عمرؓ نہیں تسلیم کرتے اور مزید برآں اسے تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں بتاتے اور کیوں بتاتے جبکہ وہ ایک "پوشیدہ علت" تھی؟ اور سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کو نہ تو حضرت عمارؓ "منکر حدیث" کہتے ہیں، نہ دیگر صحابہ۔

اور ان سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ کہ ایک حدیث جو دور فاروقی میں غیر صحیح اور ناقابل عمل تھی وہی بعد میں اس قدر مستفیض ہوئی کہ عدم صحت کا وہم جاتا رہا اور بالاتفاق لائق عمل ہوگئی۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا؟ جنبی اگر پانی نہ پائے تو اس کے لیے تیمم بعد کے دور میں جائز اور لائق عمل ہو گیا۔ مگر کس دلیل سے اور کیوں؟ قرآن سے اب بھی اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ مسئلہ حدیث شریف ہی سے لیا گیا ہے اور حدیث بھی وہ جو پہلے غلط اور ناقابل عمل تھی اور بعد میں مستفیض ہو کر صحیح اور قابل عمل ہوگئی۔ اگر یہ حدیث نہ ہوتی تو "فتیمموا صعیداً طیباً" والی دونوں آیتوں کو کہاں سے سہارا ملتا؟ یہی تو وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ آخری دم تک اپنے مسلک پر قائم رہے؟ قرآن میں اگر کوئی آیت تھی تو ہوا کرے، جب تک کسی روایت کا سہارا نہ ہو بےچاری آیت تنہا کیا کرسکتی ہے؟ حضرت عمرؓ

کو چونکہ کوئی روایت نہ ملی اور جو ملی تھی تو اس میں کوئی پوشیدہ علت تھی۔ اس لیے ان آیات تیمّم کو آپؓ نے چنداں لائق اعتنا نہ تصور فرمایا۔ العیاذ باللہ۔

ایک اور نکتہ بھی قابل غور ہے۔ آیت تیمّم میں دونوں جگہ طریقۂ تیمّم بھی بتا دیا گیا ہے:

فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُم مِّنْهُ (۵:۶)

یعنی پاک مٹی سے اپنے چہروں اور ہاتھوں کو مسح کرو۔

مگر روایت میں ہے کہ حضرت عمارؓ مٹی میں لتھڑ گئے۔ (لفظ کہیں تمعّک ہے اور کہیں تمرغ) اور کیوں نہ لتھڑتے؟ ان کی نظر آیات قرآنی پر ہوتی جب تو انہیں طریقہ تیمّم معلوم ہوتا؟۔ معلوم نہیں یہ روایت بیان کرنے سے راوی کا کیا مقصد تھا جو اس نے ایک سرے سے سارے صحابہ کو قرآن سے بے خبر ثابت کر دیا۔

ذرا یہ بھی ذہن میں رکھیے گا کہ یہ واقعہ نزول تیمّم کے بعد کا ہے۔ اگر پہلے کا ہوتا تو تیمّم کرنے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا، بلکہ پہلے عمارؓ حضورؐ سے دریافت کرتے کہ اس حالت میں میں کیا کروں؟ اپنی طرف سے عمارؓ کوئی اقدام نہ کرتے۔ نیز اگر نزول تیمّم کے بعد کا یہ واقعہ ہوتا تو عمارؓ اتنے بے خبر نہ تھے جو "فامسحوا بوجوھکم وایدیکم منہ" کا مطلب مٹی میں لوٹ جانا سمجھتے اور اسی پر عمل کرتے۔ حضرت عمارؓ اپنا یہ واقعہ حضورؐ کے بہت بعد بیان فرماتے ہیں۔ اگر حضورؐ کی زندگی میں بیان کرتے تو اس کا سیدھا فیصلہ یہ ہوتا کہ حضورؐ سے جا کر دونوں دریافت یا تصدیق فرما لیتے، لیکن راوی تو یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ دور فاروقی تک صحابہ میں کسی کی نظر قرآن تک نہ گئی۔ ہر شخص کی نظر احادیث پر لگی رہتی تھی۔ مگر افسوس کہ قرآنی حکم تو یوں گیا کہ اس پر حضرت عمرؓ کی نظر ہی نہ پڑی اور عمل بالحدیث یوں گیا کہ جو روایت ملی بھی اس میں کوئی رازدارانہ پوشیدہ نقص تھا۔ اور یہ گتھی آخر عمرؓ تک حضرت عمر سے نہ کھل سکی۔ کھلی تو بعد والی لوگوں پر "طبقہ ثانیہ" میں۔

اس روایت سے ایک معمولی سمجھ کا انسان بھی اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ ایک صاف و صریح قرآنی مسئلہ بھی حضرت عمرؓ کے پیش نظر نہ رہتا تھا۔ حضرت عمارؓ بھی اس سے بے خبر تھے اور صحابہ میں کوئی بھی نہ تھا جو قرآن سے استدلال و استشہاد کر کے اصل مسئلہ بتاتا۔ سب کی نظریں قرآن سے ہٹ کر صرف احادیث پر لگی رہتی تھیں۔ یعنی اگر کوئی روایت مل گئی تو فبہا ورنہ قرآن کے صاف و صریح مسئلے کو بھی وہ اپنے لیے کافی نہ سمجھتے تھے اور کبھی ادھر ان کی توجہ نہ گئی۔

بہر کیف راوی ایک لحاظ سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا، اور آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو قرآن سے پہلے کسی روایت ہی کو تلاش کرتے ہیں۔ اگر روایت کا سہارا مل گیا تو مجبوراً قرآنی حکم کو بھی تسلیم کر لیں گے ورنہ روایت اگر اس کے خلاف ملی تو آیت ہی کی تاویل فرمادیں گے...... یہ اثر اسی قسم کی روایت کا ہے جس کا نمونہ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ لیکن کیا اس کے لیے بھی آپ کسی کو تیار پائیں گے کہ ایسی مشتبہ روایات کو صحاح و متن سے خارج کر کے صرف صحیح روایات کو باقی رہنے دیا جائے؟ آپ قرآن کریم میں منسوخ الحکم اور منسوخ التلاوۃ اور منسوخہما کا اعتراف تو کر سکتے ہیں مگر روایت کی کتابوں میں تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے کیونکہ...... "بعد میں سب کی سب اس قدر مستفیض ہو گئیں کہ عدم صحت کا وہم جاتا رہا اور بالاتفاق سب کی سب لائق عمل ہو گئیں۔

نقطہ ہائے نظر کا تباین

غرض ایک شخص کی نگاہ معاملات کے چند متغیر و متبدل جزئیات پر پڑتی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ یہاں احادیث پر بعینہا عمل نہیں ہو سکتا تو وہ یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ پورے کا پورا دفتر روایات ہی ناقابل عمل ہے۔ چند روایات کو خلاف قانون پاتا ہے تو یہ طے کر

کے اٹھتا ہے کہ سارا ذخیرہ ہی خلاف قرآن ہے۔ چند ضعیف یا موضوع روایات کو دیکھ لیتا ہے تو یقین کر لیتا ہے کہ احادیث نام ہی ہے اس مجموعے کا جو کلیۃً ساقط الاعتبار ہو...... اور یہی دوسری طرف بھی ہو رہا ہے۔ ان لوگوں کی نظر طریقہ نماز پر جاتی ہے جو انہوں نے تعامل کے بعد روایات سے حاصل کیا ہے اور وہ اس نماز میں کسی عقلی ترمیم کی گنجائش نہیں پاتے، اس لیے متغیر معاملات کے ہر ہر جز کے بارے میں بھی اپنا آخری فیصلہ یوں صادر فرماتے ہیں کہ روایات میں جو کچھ بھی ہے وہ سب کا سب غیر متبدل ہے اور یہ سارا ذخیرہ قرآن کی طرح ناقابل ترمیم وتبدیل ہے۔ اگر ذرا بھی فرق کیا گیا تو یہ وحی کا انکار ہوگا۔ ایسی وحی کا انکار جو مثلہ معہ کا درجہ رکھتی ہے اور ایسی ہی بدعتوں کے متعلق یہ وعید ہے کہ

کل بدعة ضلالة و کل ضلالة فی النار

گویا ایک گروہ کا یہ دعویٰ کہ فلاں بات چونکہ کسی حدیث کی کتاب میں ہے، اس لیے ضرور ساقط الاعتبار ہے اور دوسرے فرقے کا یہ ادعا کہ چونکہ فلاں مجموعہ حدیث میں یہ بات موجود ہے لہٰذا یقیناً درست ہی ہے۔ غرض اب صحت وعدم صحت کا معیار نہ اسنادِ روایت ہے نہ اصولِ درایت بلکہ کسی مخصوص کتاب میں موجود ہونا ہے۔

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟

ایک اور بڑی مصیبت (صحت اور حجیت کا فرق)

سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ حجیت حدیث اور صحت حدیث کا فرق ہم جوش عقیدت میں اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ سوچیے کہ وہ کون بدبخت کلمہ گو ہوگا جو حضورؐ پر ایمان بھی لائے اور حضورؐ کے فرمان کو رد بھی کرے؟ ہم کسی کے متعلق ایسا گمان کیوں کریں کہ

اسے حضورؐ سے کوئی دلچسپی نہیں یا اس کا دل حضورؐ کی محبت، اطاعت اور عظمت کے جذبات سے خالی ہے؟ اگر کوئی مسلمان کسی روایت کو صحیح نہیں سمجھتا یا اس پر معقول وجوہ سے نقد و جرح کرتا ہے تو عموماً ہمارا پہلا گمان یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل میں رسول اللہؐ کی کوئی وقعت نہیں اور اسی لیے وہ قول رسولؐ کو ماننے سے انکار کر رہا ہے۔ العیاذ باللہ۔ حالانکہ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ قول رسولؐ نہیں ماننا چاہیے بلکہ اس کی غرض صرف یہ ہوتی ہے کہ یہ قول رسول ہے ہی نہیں یا اس قول کا انتساب حضورؐ کی طرف صحیح نہیں جس کے یہ یہ دلائل و قرائن ہیں۔ اگر ایسا شخص اپنے قیاس و فہم میں ٹھوکر کھا رہا ہے اور یہ ہر وقت ممکن ہے تو معقول دلائل سے اس کی تسکین کرنی چاہیے۔ یہ مناسب نہیں کہ چھوٹتے ہی اسے منکر حدیث اور منکر رسولؐ کا لقب عطا کر دیا جائے۔ یہ تکنیک ایک مناظر کے لیے تو کسی وقت شاید موزوں ہو جائے لیکن ایک مخلص مبلغ کو زیب نہیں دیتی۔

طریقہ تفہیم

ایک مخلص ناقد کہہ سکتا ہے کہ فلاں روایت:

فلاں آیت کے مضمون سے متناقض ہوتی ہے...... یا

اس سے انبیا کی صداقت و امانت یا کردار و سیرت پر حرف آتا ہے...... یا

یہ عقل اور مشاہدے کے مطابق نہیں...... یا

خود دوسری متواتر روایت کے خلاف ہے...... یا

اس کی سند میں یہ یہ خرابیاں ہیں...... یا

اس کے فلاں فلاں راوی لائق احتجاج نہیں ...... یا

اس فرمان سے حضورؐ کا اصل مقصد یہ ہے...... یا

فلاں فلاں قرائن و دلائل سے یہ فرمان وقتی ہے...... وغیرہ وغیرہ۔

تو اس کا جواب یہ ہونا چاہیے کہ:

قرآن سے اس کا تعارض نہیں۔

عصمتِ انبیا میں اس سے کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔

عقل اور مشاہدے کے مطابق ہے۔

دوسری روایات متاثرہ سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔

سند ٹھیک ہے۔

رواۃ قابل اعتماد ہیں۔

اور ان سب باتوں کے لیے یہ یہ دلائل و قرائن ہیں۔

معترض کے شبہات کا صحیح جواب تو اسی انداز کا ہونا چاہیے، نہ یہ کہ تم منکر حدیث ہو اس لیے منکر رسول، اس لیے...... اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خود ہمارا ایمان بھی فرمان رسولؐ پر نہیں بلکہ اس راوی پر ہے جو حدیث بیان کر رہا ہے، بلکہ اس مصنف و مؤلف پر ہے جس نے اپنی تصنیف و تالیف...... صحیح، سنن، مسند، معجم، مصنف وغیرہ...... میں روایت در روایت سن کر درج کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے نہ کہ کسی مصنف کی عصمت تصنیف پر۔ اگر ہم مصنف و مؤلف کے اخلاص پر بھی ایمان لے آئیں تو یہ خوش عقیدگی بُری نہ ہوگی۔ بایں ہمہ کسی کا اخلاص باعث صد ہزار اجر ہونے کے باوجود عصمت اور عدم خطا کی ضمانت نہیں ہو سکتا۔

ایک واضح دلیل

ذرا اس روایت پر غور فرمایئے کہ سیدنا ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے

بلا واسطہ اور براہ راست یہ عام بشارت سنتے ہیں کہ:

من قال لاالہ الا اللہ دخل الجنۃ

ابو ہریرہ باغ سے باہر آتے ہیں۔ سب سے پہلے جناب عمر فاروقؓ ملتے ہیں۔ جن سے یہ حدیث بیان کرتے ہیں اور مار کھا کر واپس چلے جاتے ہیں۔ ...... جناب عمرؓ اس حدیث کی اشاعت کو روکنے کا مشورہ دیتے ہیں، اور حضور قبول فرما لیتے ہیں۔ انتہی ملخصاً۔

ذرا غور فرمایئے:

ابو ہریرہ سچے ہیں اور حافظے کے بے حد قوی ہیں۔

الفاظ حدیث بہت واضح ہیں جس کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں۔

ابو ہریرہ براہ راست زبان رسالت سے سن کر آئے ہیں۔

سنے ہوئے زیادہ عرصہ گزر جائے تو یادداشت میں غلطی کا امکان ہے لیکن سنے ہوئے ابھی چند لمحے گزرے ہیں اس لیے ایسی کسی غلطی کا بھی امکان نہیں۔

رسول اللہؐ بھی تصدیق فرماتے ہیں کہ ہاں یہ فرمایا گیا ہے اور ابو ہریرہؓ نے بیان میں کوئی غلطی نہیں کی ہے (ورنہ حضورؐ اصلاح فرما دیتے)۔

عمر فاروقؓ بھی ابو ہریرہؓ کو نعوذ باللہ کاذب نہیں سمجھتے۔

آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں نا؟ ان تمام صداقتوں اور تصدیقات و مویدات کے ہوتے ہوئے سیدنا عمر فاروقؓ کے لیے جناب ابو ہریرہؓ کی بیان کردہ حدیث سے زیادہ کس کتاب کی لکھی ہوئی حدیث معتبر ہو سکتی تھی؟ لیکن ہوا کیا؟

۱۔ محدث (ابو ہریرہؓ) اس نقل حدیث کے صلہ و انعام میں مار کھاتا ہے۔

۲۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ اس مار کا قصاص بھی عمرؓ سے نہیں دلوایا جاتا۔

۳۔ اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ حدیث کی اشاعت خود پیغمبر ایک غیر پیغمبر

کی رائے سے روکنے کی تائید کرتا ہے۔

آپ نے دیکھا؟

بلغ ما انزل الیک

کی تعمیل حکم کا کتنا شاندار نمونہ پیش کر رہی ہے یہ روایت؟ اسے بھی نہ بھولیے گا کہ اصل حدیث

......من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ......

کا دنیائے معاملات سے تعلق نہیں۔ ایک خالص بنیادی عقیدے کا معاملہ ہے اور الہامی بشارت میں اس کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ایک خالص عقیدے کی مصلحتاً (تغافل عمل کے خوف سے) روکنے والے کو بھی ''دشمن حدیث'' کا لقب نہیں دیا جاتا۔ نہ حضورؐ یہ لقب دیتے ہیں نہ ابوہریرہؓ، نہ کوئی دیگر صحابی اور نہ اس روایت کو نقل کرنے والا کوئی بڑے سے بڑا محدث اس کی جرأت کر سکا اور نہ ہم آپ اس جرأت کا خیال دل میں لا سکتے ہیں۔

نتیجہ

یہیں سے یہ حقیقت بھی واشگاف ہو جاتی ہے کہ صحابہؓ حضورؐ کے فرامین کو واجب الاطاعت جاننے کے باوجود تنزیل یا مثلہ معہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ خود حضورؐ بھی ایسا نہیں سمجھتے تھے۔ ورنہ

بلغ ما انزل الیک

کا تقاضا تو یہ تھا کہ حضورؐ جناب عمرؓ کو ڈانٹتے اور اس حدیث کی اشاعت کا ان کو بھی حکم دیتے۔ یہ اتنی واضح اور صاف بات ہے کہ اگر سنجیدگی اور صحیح انداز فکر کے ساتھ اس پر غور کیا جائے تو اسے رد کرنے میں عجلت کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔ خود ہی سوچیے کہ تنزیل کی ہم پلہ (مثلہ معہ) پھر عقائد سے تعلق رکھنے والی حقیقت، پھر ایک صحابی کی رائے سے اور پھر حضورؐ

خود اس کی اشاعت کو روکنے پر راضی ہو جائیں۔ کیا یہ ممکن ہے؟ خصوصاً جب کہ ہم صلح حدیبیہ کے موقع پر دیکھتے ہیں کہ ایک دو کے سوا تمام کے تمام چودہ سو مہاجرین وانصار (جن میں خود عمر فاروق سب سے آگے ہیں) کی متحدہ دل شکنی اور اختلاف رائے کے باوجود حضورؐ ایک کی بھی پروا نہیں کرتے اور وہی معاہدہ فرماتے ہیں جس سے ساری قوم دل شکستہ ہو رہی ہے حالانکہ یہ متبدل معاملات سے تعلق رکھنے والی چیز ہے غیر متبدل عقائد سے متعلق نہیں۔

سلسلے کی چند اور کڑیاں

ہم نے ابھی عرض کیا ہے کہ ابو ہریرہؓ والی مندرجہ بالا روایت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام فرامین رسالت کو نہ صحابہ مثل تنزیل سمجھتے تھے نہ خود حضور اکرمؐ...... ''دنیوی معاملات'' تو الگ رہے اس سے باہر ''خالص دینی معاملات'' میں بھی حضورؐ کی تمام باتوں کو غیر متبدل تصور کیا گیا۔ بہتر ہوگا کہ اس سلسلے کی چند کڑیاں بطور مثال اور بھی پیش کر دی جائیں۔

پہلی مثال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک رمضان کے عشرہ اواخر کی تین غیر مسلسل راتوں میں آٹھ آٹھ رکعات باجماعت تراویح پڑھی۔ صدیق اکبرؓ کے دور میں بھی اس پر کوئی باقاعدہ مواظبت ثابت نہیں۔ لیکن حضرت عمرؓ کے دور میں ہر سال رمضان کی ہر شب بلاناغہ بیس بیس رکعت باجماعت تراویح پڑھی گئی۔ دور عثمانی وعلوی میں بھی اسی کی پیروی ہوتی رہی اور آج تک بیشتر حضرات اسی کی پیروی فرمایا کرتے ہیں۔ دیکھیے یہ معاملہ طلاق یا حدود یا تعزیر کا نہیں (جس کا ذکر ہم سنت خلفا کے تحت پچھلے صفحات میں کر چکے ہیں) ان مثالوں کو تو ''نیم دین اور نیم دنیا'' کہہ دیا جائے گا۔ لیکن یہاں نماز کا معاملہ تو ''خالص دینی'' معاملہ ٹھہرا۔ پھر کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے کی اجازت دی جائے گی کہ ''عبادات''

(مناسک) کے معاملے میں بھی حضرت عمرؓ حضورؐ کی تمام باتوں کو وحی نہیں تصور فرماتے تھے؟

دوسری مثال

ایک ''خالص دینی'' معاملے کی مثال اور بھی سنیے۔ حضورؐ کے وقت سے لے کر آغاز دورِ عثمانی تک یہ ہوتا رہا کہ لوگ جمعہ کی اذان سن کر جمع ہو گئے اور خطبہ جمعہ شروع ہو گیا۔ لیکن سیدنا عثمان نے اذان جمعہ سے پہلے ایک اور اذان کا اضافہ فرمایا اور آج تک وہ اذان عثمانی سارے عالم اسلام میں مسلسل چلی آ رہی ہے حالانکہ جس ضرورت سے اس وقت اس اذان کا اضافہ ہوا تھا وہ ضرورت اب باقی نہیں رہی۔ معلوم نہیں لوگ اس اضافۂ اذان کو خلافِ سنت اور عین بدعت کہیں گے یا پیروی سنت یا اتباع حدیث؟

نتیجہ

ان مثالوں کو پڑھنے کے بعد یہ بخوبی سمجھ میں آ جاتا ہے کہ جب ایسے نازک اور ''خالص دینی معاملوں'' میں بھی صحابہ حضورؐ کی تمام باتوں کو وحی تنزیلی اور غیر متغیر حقیقت نہیں سمجھتے تھے تو معاملات کی دنیا (یا دنیوی معاملات) سے متعلق احادیث کو ''مثلہ معہ من جمیع الوجوہ'' کب سمجھتے ہوں گے۔

ایک اور اہم نتیجہ

جناب ابوہریرہؓ کی مندرجہ بالا روایت سے ایک اور اہم نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ راوی یا مؤلف (مصنف) کا مخلص یا نیک نیت اور صادق ہونا اور چیز ہے اور اس پر نقد و جرح کرنا اور شے ہے۔ تنقید یا مطالبہ دلیل کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ راوی کو کاذب یا غیر مخلص سمجھا جا رہا ہے، بلکہ اس سے مقصود مختلف پہلوؤں سے تسکین حاصل کرنا ہوتا ہے، اس لیے کہ عین ممکن ہے کہ

فی نفسہ وہ روایت ہی صحیح نہ ہو اور وہ صحیح سمجھ کر بیان کر رہا ہو اور اس کے سقیم پہلو تک اس کی نگاہ نہ پہنچی ہو یا لفظوں کے ردو بدل نے اصل مفہوم پر اثر ڈالا ہو وغیرہ وغیرہ۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر مصنف اپنی ہر تصنیف کی ہر روایت کے ہر پہلو پر ہر حیثیت سے ہر آن گہری نظر رکھتا ہو۔ پس آج اگر کوئی شخص کسی بڑی سے بڑی جامع صحاح وسنن کی کسی روایت کو کسی دلیل سے غلط کہے تو اس کا مطلب یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ''یہ منکر حدیث اور دشمن حدیث'' ہے۔ وہ معترض بھی اسی طرح مخلص ہو سکتا ہے جس طرح خود مصنف یا راوی ہو سکتا ہے۔ معترض کا مطلب صرف اسی قدر ہوتا ہے کہ وہ اس روایت کا انتساب حضورؐ کی طرف صحیح نہیں سمجھتا۔ انکار حدیث اور انکار انتساب حدیث کے فرق کو کسی وقت نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

خلاصہ کلام

ہم پھر اپنے مرکز کی طرف لوٹیں تو خلاصہ کلام یہ نکلے گا کہ اگر مجموعہ احادیث میں سے صرف صحیح حصے چھانٹ لیے جائیں اور پھر ان میں سے وہ حصے الگ کر لیے جائیں جو صرف ''معاملات'' سے تعلق رکھتے ہیں تو ان میں وحی یا الہام کا کوئی عنصر نہیں ملے گا۔ البتہ وہ اسلامی نظام کے معاملاتی حصے ہیں جو ایک خاص نقشہ بنانے میں ہماری بہترین رہنمائی کرتے ہیں لیکن اس سے یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ وہ نقشہ اپنے تمام جزئیات سمیت ہمیشہ بلا تغیر ایک ہی شکل وصورت میں رہنا چاہیے۔ وہ نقشہ خود تغیر پذیر ہے اور مقتضیات زمانہ سے اس میں ضروری تغیر وتبدل کرنا عین منشائے نبوت ہے اور یہی چیز ہے جسے ہم ''اتباع سنت'' کہتے ہیں۔ اگر اس نقشہ زندگی کو جامد اور ابدی سمجھا جائے تو یہ اتباع حدیث ہوگا اور یہ ہرگز حضورؐ کا منشا نہ تھا۔ اس میں وقتی تقاضوں کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ اتباع حدیث نہیں مگر عین اتباع سنت ہوگا۔

ایک غور طلب نکتہ

اتباع کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ ہادی کی "فکر صحیح" کو اپنا لیا جائے اور اس راستے سے اس کے خصائل پیدا ہو جائیں۔ اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہادی کے عادات و خصائل کو اپنا کر اس راہ سے اپنے اندر اس کی فکر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ ان دو راستوں میں صحیح راستہ پہلا ہے۔ فکر کو اپنانے کے بعد اس کی عادات و اخلاق اور خصائل و فضائل خود بخود پیدا ہو جائیں گے۔ اگر اس میں کچھ خامی بھی رہ جائے تو وہ مضر نہ ہو گی۔ لیکن اگر صرف عادات و خصائل کو اپنایا جائے اس توقع پر کہ فکر نبوی خود بخود اسی سانچے میں ڈھل جائے گی تو اغلباً یہ صحیح نہیں۔

آج یہی عموماً ہو رہا ہے کہ حضورؐ یوں بولتے تھے اس لیے ہمیں بھی یوں ہی بولنا چاہیے۔ حضورؐ یوں کھاتے، پہنتے اور چلتے تھے لہٰذا ہمیں بھی یوں ہی کرنا چاہیے۔ آج بھی اس طرح کا اتباع کرنے والوں کی کمی نہیں لیکن نتیجہ آپ ہم سے بہتر جانتے ہیں، کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس روش میں اخلاص تو ہو سکتا ہے اور شاید باعث اجر عظیم بھی ہو لیکن وہ روح نہیں پیدا ہوتی جو معاملات اور مسائل زندگی میں صحیح فیصلہ کرنے والی عقل و بصیرت اور قوت اجتہاد پیدا کر سکے۔ اسی کو ہم اتباع حدیث کہتے ہیں۔ مگر اتباع سنت اس سے بہت بلند و برتر چیز ہے۔ اس میں روح نبوت کو اپنایا جاتا ہے اور وہی زندگی کے پورے نقشے کو بدل دیتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ہم پچھلے صفحات میں لکھ چکے ہیں کہ حضورؐ نے علیکم بسنتی فرمایا ہے علیکم بحدیثی نہیں فرمایا۔

حرف آخر

قرآن پاک میں بیسیوں جگہ اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے ان میں تین

مقامات خاص طور پر غور طلب ہیں:

ا۔ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ (۴:۶۴)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا وہ اسی لیے بھیجا کہ اس کی اطاعت کی جائے باذن الٰہی۔

باذن اللہ سے مقصد ہے خدائی منظوری (Sanction) یعنی رسول ہوتا ہی ہے اطاعت کے لیے۔

۲۔ مَّنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ (۴:۸۰)

جو رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ عین خدا کی اطاعت کرتا ہے۔

اس آیت میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ بغیر اطاعت رسول کے اطاعت الٰہی کی کوئی شکل ہی نہیں۔

۳۔ أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ (۴:۵۹)

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور اپنے اولی الامر کی اطاعت کرو۔

اس آیت میں اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کا بھی حکم ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ اللہ کی اطاعت کو الگ رکھا گیا ہے اور رسول کی اطاعت کے ساتھ ملایا گیا ہے۔

ان تمام آیات کو سامنے رکھنے بعد چند سوال پیدا ہوتے ہیں:

ا۔ اگر رسول کی اطاعت اسی طرح کلی طور پر مطلقاً ضروری ہے تو کیا یہ اطاعت رسول کی زندگی ہی تک ہے یا بعد کے لیے بھی ہے؟

۲۔ اطاعت رسول کی جتنی آیات ہیں وہ سب کی سب مدنی ہیں۔ پس اگر یہ اطاعت مطلقاً ہے تو مکی زندگی میں حضورؐ کی حیثیت مطاع کی تھی یا نہیں؟

۳۔ اللہ، رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعتوں میں کیا فرق ہے اور ان کی حدود کیا ہیں؟

ان سوالوں کے جواب میں کچھ پیچیدگی سی محسوس ہوگی لیکن غور کرنے سے کئی گتھیاں سلجھ جائیں گی۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کی کوئی شکل ہی ممکن نہیں بغیر رسول کی اطاعت کے۔ جن احکام الٰہی کی اطاعت کا نام اطاعت الٰہی ہے وہ آتے ہی ہیں بواسطہ رسولؐ۔ اسی لیے کہا گیا ہے جو رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے وہ عین اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔ رسولؐ کے بعد وہی اطاعت اولی الامر کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور ان کی اطاعت بھی عین اطاعت خداوندی ہوتی ہے۔ رسولؐ ہو یا اولی الامر سب کا مقصد خدا ہی کی اطاعت کرانی ہوتی ہے لہٰذا اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے خواہ کسی کے واسطے سے ہو۔ لیکن جس طرح اللہ اور رسولؐ کی اطاعت ضروری ہونے کے باوجود رسول عین خدا نہیں ہو جاتا اسی طرح رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعت ضروری ہونے کے باوجود اولی الامر اور رسولؐ ایک ہی درجے میں نہیں رکھے جا سکتے۔

ایک نکتہ

اطاعت رسولؐ کی تمام آیات مدنی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اطاعت ہمیشہ امر کی ہوتی ہے۔ جیسا کہ "اطیعوا امری" نیز "ولا تطیعوا امر المسرفین" سے معلوم ہوتا ہے۔ امر کا صحیح مطلب ہے حکم، قانون فیصلہ (Law and order) ان چیزوں کا تعلق ریاست (state) سے ہے۔ اسلامی ریاست کا دور مدنی زندگی سے شروع ہوتا ہے۔ حضورؐ مکی زندگی میں بھی عین مطاع تھے لیکن قانونی یا ریاستی حیثیت وہاں نہ تھی، ہاں رضا کارانہ خوش دلی تھی۔ مدنی زندگی سے اس میں ایک چیز کا اور بھی اضافہ ہوا اور وہ چیز تھی

قانون، فیصلہ، حکم، امر۔ یہی وجہ ہے کہ مکی زندگی میں اطاعت کا حکم نہ دیا گیا اور حضورؐ کے فرستادہ مبلغین مثلاً مصعب بن عمیرؓ کو نقیب کہا گیا، لیکن امیر کسی کو نہ کہا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ریاست کے مفہوم کے بغیر امیر کہا جانا درست نہ تھا۔ جب مدنی زندگی میں امارت و ریاست کا دور شروع ہوا تو اولی الامر بھی ہونے لگے۔ خود مدنی زندگی میں ہی دیکھیے جو لوگ رئیس المبلغین بنا کر باہر بھیجے گئے امیر کا لقب انہیں بھی نہیں ملا۔ بس رئیس، قاری، معلم وغیرہ کہے گئے کیونکہ امارت کا لفظ ''ریاست'' کے مفہوم سے جدا نہیں ہو سکتا۔ مدنی زندگی میں وہی لوگ امرا یا اولی الامر کہے گئے جن کا تعلق ریاستی نظم و نسق سے تھا، نہ کہ محض تبلیغ سے۔

لہٰذا حضورؐ ابتدا سے انتہا تک مطاع تھے اور پردہ فرمانے کے بعد بھی بایں معنی مطاع ہیں کہ ہر اسلامی ریاست و امارت کے نظام میں حضورؐ کے فیصلے (اگر ان میں تغیر و تبدل ضروری نہ ہو) تمام دوسرے فیصلوں پر مقدم ہوں گے۔ بنیاد صرف کتاب اللہ ہے باقی تمام چیزیں نظائر و مویدات (Precedents) کا مقام رکھتی ہیں اور ان میں فرامین نبویؐ سب پر مقدم ہیں۔

دو حیثیتیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو الگ الگ حیثیتوں کو کبھی نہ بھولنا چاہیے۔ حضورؐ ایک تو امیر المومنین تھے محمد بن عبداللہ کی حیثیت سے اور دوسرے پیغمبر تھے محمد رسول اللہ کی حیثیت سے۔ زندگی میں یہ دونوں اطاعتیں یک جا تھیں لیکن بعد از وفات پہلی قسم کی اطاعت ختم ہو کر نائبین میں منتقل ہو گئی اور دوسری اطاعت قیامت تک کے لیے ''رسالت''، یعنی قرآن کی صورت میں موجود ہے۔ پس حضورؐ نے جو کچھ رسول اللہ کی حیثیت سے دیا یا فرمایا اس میں کسی تغیر و تبدل کا امکان نہیں۔ لیکن دوسری حیثیت کے فرامین ہر فرمان پر مقدم ہونے کے باوجود بجائے خود متبدل ہیں اور وحی نہیں۔